بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# خطبۂ جمعہ

## عربی متن کا مفہوم

## خطبۂ جمعہ کی اہمیت اور غرض و غایت

خطبۂ جمعہ کی اصل غرض و غایت کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید اور آنحضور ﷺ کے معمول کو دیکھنا چاہیے کہ خطبۂ جمعہ کا اصل مقصد کیا تھا اور اجتماعِ جمعہ کا یہ عظیم نظام کن مقاصد کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ آج ایسے مسلمان جو پنج وقتہ نماز نہ بھی پڑھتے ہوں' ان کی بھی ایک بڑی تعداد نہا دھو کر اور حتی الامکان صاف ستھرے کپڑے پہن کر نہایت اہتمام سے خطبۂ جمعہ کے لیے مسجد میں پہنچتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک بہت عظیم نظام کے کچھ کھنڈرات ہیں کہ جو باقی ہیں۔
قرآن مجید کے اٹھائیسویں پارے کی سورۃ الجمعہ کا شمار ان چند سورتوں میں ہوتا ہے جن کے مندرجات کے ساتھ اُن کے نام کی بڑی گہری معنوی نسبت ہے۔ دو رکوعوں پر مشتمل اس سورت کے دوسرے رکوع میں تو واضح طور پر خطبۂ جمعہ کی اہمیت اور اس کے آداب پر گفتگو ہے۔ پہلے رکوع کے مضمون کا بظاہر کوئی تعلق نظامِ جمعہ سے نظر نہیں آتا' لیکن غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت اس میں خطبۂ جمعہ کی غرض و غایت ہی بیان کی گئی ہے۔ اس کی دوسری آیت میں آنحضور ﷺ کے اُس عملِ تربیت کا ذکر ہے جس کے ذریعے سے آپؐ نے ایک ایسی عظیم انقلابی جماعت کو تشکیل دیا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے وقت کی دو بڑی طاقتوں کو قدموں تلے روند کر تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کر دیا۔
اس انقلابی عمل کے لیے قرآن مجید نے چار الفاظ استعمال کیے ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے اُمّیین کے اندر ایک رسول خود اُنہی میں سے اٹھایا۔ وہ ان (اپنی قوم) کے سامنے (اللہ کی) آیات تلاوت کرتے ہیں' اور اُن کا تزکیہ کرتے ہیں''۔ یعنی آیاتِ الٰہی کی تلاوت کے نتیجے میں جو لوگ حق کا اعتراف کر لیں اور اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر یہ امر تسلیم کر لیں کہ کُل کائنات اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے' آپؐ ان کے قلب اور نفس کو پاک کرتے ہیں۔ از روئے قرآن تزکیہ کا اصل ذریعہ بھی خود قرآن ہی ہے۔ آگے ارشاد ہوا: ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ق﴾ ''اور وہ (رسول) انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں''۔ کتاب سے مراد اگرچہ پورا قرآن بھی ہے' لیکن درحقیقت لفظ ''کَتَـــبَ'' کے معنی کسی چیز کو فرض کر دینے اور لکھنے کے ہیں۔ لہٰذا لفظ کتاب کے اندر اصل اشارہ احکامِ شریعت کی طرف ہے۔ چوتھی

بات یہ آئی کہ رسول صرف احکامِ شریعت ہی نہیں بتاتے بلکہ عقل و دانش کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ کوئی چیز فرض کیوں کی گئی ہے‘ فلاں شے حرام کیوں ہے‘ یہ باتیں حکمتِ دین کے ذیل میں آتی ہیں۔ اسی طرح فکری رہنمائی جسے فلسفی اور دانشور اپنا موضوع سمجھتے ہیں‘ وہ بھی اسی قرآن مجید میں ہے۔

مکی دَور میں آنحضور ﷺ نے مسلسل تیرہ برس صرف یہی چار کام کیے ہیں۔ یہ چار الفاظ قرآن مجید میں چار مختلف مقامات پر آئے ہیں: تلاوتِ آیات‘ تزکیہ‘ تعلیمِ کتاب‘ تعلیمِ حکمت۔ ذرا غور کرنے پر پتا چلتا ہے کہ یہ چاروں کام قرآن کی تعلیم ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے احکاماتِ شریعت بھی ہیں‘ آیات کے ذریعے انسان کی باطنی بیماریوں کا علاج بھی موجود ہے‘ اور پھر حکمت کی اعلیٰ ترین سطح بھی قرآن ہی کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ سارا کام قرآن کے گرد ہی گھوم رہا ہے۔ قرآن ہی کی بدولت عرب قوم کی سوچ‘ اس کے نقطۂ نظر‘ اندازِ فکر‘ اخلاق و کردار اور سیرت غرض ہر شے میں تبدیلی آئی‘ جو ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ بنی۔ اس انقلاب کے اثرات کو باقی رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ قرآن کے ساتھ رشتہ مضبوط رہے۔ چنانچہ جمعہ کا نظامِ اصل میں اسی تعلیم قرآن پر مبنی ہے۔

سورۃ الجمعہ کی پانچویں آیت میں بنی اسرائیل کے حوالے سے فرمایا گیا کہ: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا﴾ ’’مثال اُس قوم کی جس پر لادی گئی تھی تورات‘ پھر انہوں نے اس کو نہیں اٹھایا‘‘۔ یعنی کتاب کے ضمن میں عائد ہونے والی ذمہ داری کو ادا نہیں کیا۔ بنی اسرائیل کو اللہ نے جو کتاب (تورات) دی تھی اس میں ہدایت بھی تھی اور روشنی بھی‘ لیکن اُس قوم نے اِس نعمت کی قدر نہیں کی اور کتاب کے ساتھ اپنے رشتے کو کمزور کر لیا۔ چنانچہ اب اللہ کی نگاہ میں ان کی کیا حیثیت ہے‘ اس کے بارے میں آگے فرمایا گیا: ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ﴾ ’’ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ (اپنی پیٹھ پر) اٹھائے ہوئے ہو‘‘۔ غور کیجیے کہ عظیم ترین نعمت کی ناقدری کرنے پر اللہ کی نگاہ میں یہ مقام رہ جاتا ہے! اسی لیے قرآن حکیم کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کو برقرار رکھنے اور اس کی ہدایت سے مسلسل فائدہ اٹھانے کے لیے جمعہ کا نظام ترتیب دیا گیا۔

نبی کریم ﷺ کے خطبۂ جمعہ کی کیفیت احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے کہ حضرت جابر بن سمرہ ؓ روایت کرتے ہیں: ((كَانَتْ لِلنَّبِيِّ ﷺ خُطْبَتَانِ يَجْلِسُ بَيْنَهُمَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيُذَكِّرُ النَّاسَ)) ’’نبی ﷺ جب خطبہ ارشاد فرماتے تھے تو اس کے دو حصے ہوتے تھے‘‘۔ (یہاں خطبے سے مراد خطبۂ جمعہ ہے)۔ ’’دونوں کے درمیان آپؐ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھتے تھے‘‘۔ یہ اس خطبہ کی ظاہری ہیئت تھی۔ اس میں کیا کہا جاتا تھا‘ اس کے بارے میں آگے بیان ہے۔ ’’آپؐ قرآن کی آیات پڑھتے تھے اور لوگوں کو تذکیر اور نصیحت فرماتے تھے‘‘۔ یہ ہے خطبۂ جمعہ کی غرض و غایت‘ جس کا ایک معنوی تعلق آنحضور ﷺ کے اس عمل کے ساتھ بنتا ہے جو سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں مذکور ہے۔ یہ کام حضور اکرم ﷺ پر آ کر ختم نہیں ہو گیا بلکہ قیامت تک جاری رہے گا۔ جب تک کُل کرۂ ارضی پر اللہ کا دین قائم اور غالب نہیں ہو جاتا یہ مشن ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے۔

بنیادی طور پر نبی کریم ﷺ کو جو مشن دیا گیا تھا‘ وہ انقلابی تھا۔ اس کا ذکر سورۃ التوبۃ کی آیت ۳۳‘ سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ اور سورۃ الصّف کی آیت ۹ میں موجود ہے‘ جن کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو دو چیزیں دے کر بھیجا: ایک الہدیٰ‘ یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چلنے والے آسمانی ہدایت کے سلسلے کا فائنل اور کامل ایڈیشن‘ دوسرے دین الحق‘ یعنی نظامِ عدلِ اجتماعی۔ یہ دو چیزیں دے کر رسول اللہ ﷺ کو اس لیے بھیجا گیا تاکہ وہ اللہ کے اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دیں۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اس مشن کو آنحضور ﷺ نے بنفسِ نفیس مکمل فرما دیا تھا‘ تاہم اس آیت کی تکمیل کما حقہٗ اُس وقت ہو گی جب پورے کرۂ ارضی پر یہ نظام نافذ ہو گا۔ ایک باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر دین حق کو قائم کرنے کے لیے انقلابی افراد درکار تھے۔ ایسے لوگ تیار کرنے کے لیے پہلے اُن کے اندر کی دنیا کو بدلا گیا۔ آنحضور ﷺ نے یہ عمل چار افعال کے ذریعے انجام دیا‘ جن کا ذکر سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں کیا گیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی قوم کے سامنے قرآنی آیات تلاوت کیں‘ اپنے ساتھیوں کا تزکیہ کیا‘ انہیں

احکامِ شریعت بتائے اور حکمت و دانش کی تعلیم دی۔ افراد کی یہ قلب ماہیت عالمی اور ظاہری انقلاب کا پیش خیمہ بنی۔ مسلمانوں کا انقلابی لٹریچر قرآن مجید ہے' اس لیے کہ یہ چاروں چیزیں قرآن ہی کے گرد گھوم رہی ہیں۔ تزکیہ اور باطنی بیماریوں کے علاج کا اصل ذریعہ قرآن ہے' اسی طرح احکامِ شریعت کا سب سے بڑا منبع بھی یقینی طور پر قرآن مجید ہے' جبکہ عقل و دانش کے حوالے سے یہ **الحکیم** کا کلام ہے' چنانچہ اس سے زیادہ پُرحکمت اور کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔

اِس انقلابی لٹریچر سے مسلسل استفادہ کرتے رہنے اور ایمانی جذبہ کو تروتازہ رکھنے کے لیے قیامت تک کے لیے جمعہ کا نظام تجویز کر دیا گیا۔ یومُ الجمعہ کی کچھ ساعات کا بھی تعین کر دیا گیا کہ جب نمازِ جمعہ کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد کی طرف لپکو اور ہر قسم کا کاروبار چھوڑ دو۔ ان اوقات کے اختتام کے حوالے سے بھی بتا دیا گیا کہ جب نماز مکمل ہو جائے تو اس کے بعد منتشر ہو سکتے ہو۔ سابقہ اُمت کے مقابلے میں اِس اُمت کے لیے یہ خصوصی رعایت ہے کہ وہاں ''سبت'' کا پورا دن کاروبار کو حرام کرتے ہوئے اللہ کی یاد کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ تاہم فضیلت اسی میں ہے کہ مسلمان جمعہ کا پورا دن اللہ کی یاد اور اس کی کتاب کا علم حاصل کرنے کے لیے فارغ رکھیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ متفق علیہ حدیث کے مطابق جو شخص جمعہ کے روز اچھی طرح نہا دھو کر نمازِ جمعہ کے لیے پہلی ساعت میں پہنچتا ہے اس کے لیے ایک اونٹ صدقہ کرنے کے برابر ثواب ہے۔ دوسری ساعت میں پہنچنے والے کو گائے صدقہ کرنے' تیسری ساعت میں پہنچنے والے کو ایک مینڈھا صدقہ کرنے' چوتھی ساعت میں پہنچنے والے کو ایک مرغی صدقہ کرنے' جبکہ پانچویں ساعت میں پہنچنے والے کو ایک انڈا صدقہ کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔ جب امام خطبے کے لیے نکلتا ہے تو فرشتے اپنے رجسٹر لپیٹ دیتے ہیں اور وہ بھی ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ گویا جب خطبۂ جمعہ شروع ہو جائے تو پھر یہ فضیلت ختم ہو گئی' اب محض نماز میں شرکت شمار ہوگی۔

خطبۂ جمعہ اور نظامِ جمعہ کی اہمیت کے حوالے سے ایک دو باتیں اور عرض کر دوں۔ احادیث میں ایک تو اس امر کی تاکید ہے کہ مسلمان اجتماعِ جمعہ کے لیے بڑے اہتمام سے مسواک کر کے' نہا دھو کر' صاف ستھرے کپڑے پہن کر' خوشبو لگا کر آئیں' تاکہ ایک عمدہ ماحول قائم ہو جس میں آدمی پوری یکسوئی کے ساتھ سیکھنے کی طرف متوجہ ہو۔ خطبۂ جمعہ سننے کی اہمیت کا اندازہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح مسلم کی اس روایت سے ہوتا ہے' جس کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ کے دن اگر تم نے خطبے کے دوران اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ خاموش رہو تو تم نے بھی لغو حرکت کی۔ اس بیان کی جامعیت دیکھئے کہ چند الفاظ میں کتنی عمدگی سے خطبۂ جمعہ کی اہمیت کو سمو دیا گیا۔ گفتگو سے کسی دوسرے کو روکنا بھی اگر لغو حرکت ہے تو خود بات کرنا اور خطبے کے اندر خلل ڈالنا کتنی قابل مذمت شے ہوئی' اس کا اندازہ خود کر لیجیے!

خطبۂ جمعہ درحقیقت تعلیم قرآن کا پروگرام ہے۔ قرآن کو بیان کرتے ہوئے ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کے ذریعے ہی سے اس کو سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ خطبہ قرآن و حدیث کا مجموعہ ہونا چاہیے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس سلسلے میں کام کیا اور بہت عمدگی سے اِن چیزوں کو معین فرمایا ہے جو ایک جامع خطبے میں شامل ہونی چاہئیں۔ سب سے پہلے تو اللہ کی حمد و ثنا خطبہ کا لازمی حصہ ہے۔ پھر شہادتین کا تذکرہ ہونا چاہیے۔ تیسرے یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اِس کا لازمی حصہ ہو۔ چوتھی بات یہ فرمائی کہ چونکہ قرآن مجید میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم بار بار آیا ہے اس لیے خطبے میں بھی اس کا ذکر ضرور ہونا چاہیے۔ پانچویں بات یہ کہ کچھ آیاتِ قرآنی کی تلاوت اس میں ضرور ہونی چاہیے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو خطبات مرتب کیے' ان میں انہوں نے سورۃ المؤمن کی آیت ۶۰ منتخب کی' چنانچہ خطیب حضرات عام طور پر اسی آیت کی تلاوت کرتے ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایک معین خطبہ نہیں ہوتا تھا' تاہم خطبہ کے ابتدائی الفاظ کم و بیش ایک جیسے ہوتے جن میں اللہ کی حمد و ثنا اور استغفار کا ذکر ہوتا۔ اس کے بعد قرآن کے مختلف مقامات سے آیات تلاوت کی جاتیں اور ان کے حوالے سے تذکیر اور نصیحت ہوتی۔ ہمارے ہاں چونکہ عام آدمی کو عربی

سمجھ میں نہیں آتی' لہٰذا قرآن وحدیث کی تعلیمات کے خلاصہ پر مبنی مختلف خطبات مرتب کیے گئے۔ ان میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خطبات نہایت جامع ہیں' جو پورے برصغیر میں عام ہوئے۔

آنحضور ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے خطیب دو خطبوں کے درمیان تھوڑی دیر کے لیے بیٹھتا ہے۔ پہلے اور دوسرے خطبے میں کیا کہا جاتا ہے' اس میں کوئی خاص تخصیص نہیں ہے۔ دونوں کا مقصد وعظ' تذکیر یا ددہانی اور تعلیم ہے۔ یہاں خطبۂ جمعہ کے عربی متن کا ترجمہ اور مختصر تشریح پیش کرنے کی حقیر سی کوشش کی جا رہی ہے' تاکہ اس کے مطالعے کے بعد خطبۂ جمعہ سنتے ہوئے اس کے معانی ومطالب ہمارے ذہنوں میں مستحضر رہیں۔

# خطبۂ اولیٰ

☆ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ...... اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ: ''کُل حمد وثنا اللہ کے لیے ہے' کُل تعریف اور شکر و سپاس اللہ کے لیے ہے۔ ہم اس کی حمد بیان کرتے ہیں' اور اس سے مدد چاہتے ہیں' اور اس سے بخشش ومغفرت طلب کرتے ہیں' اور اس پر ایمان لاتے ہیں' اور اس پر توکل کرتے ہیں''۔

☆ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ' اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ: ''کُل حمد وثنا اللہ کے لیے ہے۔ کل تعریف اور شکر وسپاس اللہ کے لیے ہے''۔ آج بظاہر تو یہ بات بڑی آسانی سے کہہ دی جاتی ہے' لیکن شاید اس کی ہمہ گیریت کو محسوس نہیں کیا جاتا۔ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر خیر اور خوبی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ اپنے طور پر نہ سورج کے اندر کچھ اثر ہے' نہ چاند اور ستاروں میں۔

آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ دو کلمات ایسے ہیں جو ربّ کو پہچاننے اور جاننے کے حوالے سے بہت جامع ہیں' ایک سبحان اللہ اور دوسرا الحمدللہ۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَلتَّسْبِیْحُ نِصْفُ الْمِیْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَؤُہٗ)) یعنی سبحان اللہ سے (معرفتِ ربّ کی) میزان نصف ہو جاتی ہے' جبکہ الحمدللہ سے یہ بھر جاتی ہے۔ (مسند احمد)

سبحان اللہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ ہر کمی' عیب' نقص اور کوتاہی سے پاک ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی نیک اور صالح کیوں نہ ہو' اس کی ذات میں کسی نہ کسی اعتبار سے کوئی کمی ضرور ہوگی۔ صرف ایک ذات کامل ہے۔ یہ معرفتِ ربّ کا پہلا حصہ ہے۔ دوسرا حصہ یہ ہے کہ اس کائنات کے حسن اور کمال کا سرچشمہ وہی ایک ذات ہے۔ اصل شکر اُسی کا واجب ہے۔ قرآن مجید میں جہاں انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی گئی ہے وہاں ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا کہ ﴿اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ﴾ (لقمٰن: ۱۴) ''شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا''۔ اس لیے کہ والدین کے دل میں رحمت اور شفقت ڈالنے والی ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے!

☆ نَحْمَدُہٗ: ''ہم اسی کا شکر ادا کرتے ہیں''۔ روزمرہ کے معمولات میں اس شکر کے ادا کرنے کے طریقے ہمیں نبی اکرم ﷺ نے بتائے ہیں کہ کھانا کھاؤ تو اللہ کا شکر ادا کرو (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ)۔ سو کر اٹھے ہو تو اللہ کا شکر ادا کرو (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ)۔ بیت الخلاء سے نکلے ہو تو اللہ کا شکر ادا کرو (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ)۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کو جب بھی خیر اور بھلائی پہنچے' اس کی زبان سے اللہ کے لیے کلماتِ تشکر جاری ہو جانے چاہئیں۔

☆ وَنَسْتَعِیْنُہٗ: ''اور ہم اُسی سے مدد چاہتے ہیں''۔ ہم اللہ ہی سے اعانت طلب کرتے ہیں۔ جب اللہ کی یہ معرفت حاصل ہو جائے کہ حقیقی رازق' مالک' مشکل کشا اور حاجت روا وہی ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ مانگنا ہے تو صرف اسی سے! چنانچہ خطبۂ مسنونہ میں یہ لفظ ''وَنَسْتَعِیْنُہٗ'' شامل ہے۔ یعنی

ہم ہر مشکل میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جو شے بھی مانگنی ہو اُس کے لیے اللہ ہی کی طرف دست سوال دراز کرتے ہیں۔

☆وَنَسْتَغْفِرُهٗ: ''اور اس سے بخشش ومغفرت طلب کرتے ہیں''۔ اگر کوئی غلطی اور کوتاہی ہو جائے' کوئی گناہ سرزد ہو جائے' صراطِ مستقیم سے پاؤں ڈگمگا جائیں تو معافی کے لیے بھی اللہ ہی کی جناب میں رجوع کرتے ہیں۔ بندۂ مؤمن کی زندگی کا یہ ایک بہت ہی اہم معاملہ ہے' جسے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۵ میں اس انداز سے بیان کیا گیا کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪﴾ ''اور وہ لوگ کہ جب کر بیٹھیں کوئی کھلا گناہ یا بُرا کریں اپنے حق میں تو یاد کریں اللہ کو اور بخشش مانگیں اپنے گناہوں کی۔ اور کون ہے گناہ بخشنے والا سوائے اللہ کے؟'' گناہوں کو بخشنے کا اختیار کسی پوپ' پادری یا پیر کے پاس نہیں ہے۔ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ ہی رکھتا ہے کہ کس کو معاف کرنا ہے اور کس کو نہیں۔ ہم استغفار کے لیے صرف دعا کر سکتے ہیں۔

اسی میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ کسی شخص پر حقیقت منکشف ہونے اور صراطِ مستقیم اختیار کرنے کے فیصلے کے بعد اُس سے کوئی کوتاہی اور خطا سرزد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی جناب میں رجوع کرنے کی صورت میں ایسے شخص کی استغفار ضرور قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء کی آیت ۱۷ میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ﴾ ''اُن لوگوں کی توبہ قبول کرنا اللہ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے جن سے نادانی میں کسی غلطی کا ارتکاب ہو جائے تو پھر وہ توبہ کرتے ہیں جلد ہی''۔ فوری اور سچی توبہ کی شرائط یہ ہیں کہ دل میں پشیمانی کے ساتھ اللہ کے دربار میں استغفار کی جائے' یہ عزمِ مصمم ہو کہ آئندہ یہ کام نہیں ہوگا اور انسان اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش بھی کرے۔ سورۃ الفرقان کی آیت ۷۰ میں ارشاد ہوا کہ: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ﴾ ''مگر جس نے توبہ کی اور یقین لایا اور کچھ نیک کام کیا' تو اللہ اس کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا''۔

☆وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ: ''اور ہم اُس پر ایمان رکھتے ہیں اور اُسی پر ہمارا توکل ہے''۔ ایمان کا اصل حاصل یہی ہے کہ اللہ پر یقین کامل اور توکل ہو۔ توکل کا مطلب یہ ہے کہ جب اسباب کے سارے راستے بند نظر آئیں تب بھی یہ یقین ہو کہ اللہ راستہ نکال سکتا ہے۔ قومی سطح پر آج ہم اس وصف سے محروم ہیں۔ اللہ پر توکل کے حوالے سے قرآن مجید اور آنحضورﷺ کی سیرت میں متعدد واقعات ملتے ہیں۔

☆وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّـئَاتِ اَعْمَالِنَا: ''اور ہم اللہ سے پناہ طلب کرتے ہیں اپنے نفوس کی شرارتوں سے اور اپنی بداعمالیوں سے''۔ یہ بڑی عجیب بات ہے! عام طور پر تو شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کی جاتی ہے۔ چنانچہ سورۃ النحل کی آیت ۹۸ میں فرمایا گیا: ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾﴾ ''جب تم قرآن پڑھنے لگو تو اللہ کی پناہ میں آ جاؤ شیطان مردود سے''۔ اسی طرح سورۃ الاعراف کی آیت ۲۰۰ میں ارشاد ہوا: ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ﴾ ''اور کبھی تمہیں شیطان کی چھیڑ اُبھارے تو اللہ سے پناہ طلب کرو''۔ اس کی سب سے عام شکل انسان کا مشتعل ہو جانا ہے۔ یہ بھی ایک شیطانی حملہ ہے' جس سے فوراً اللہ کی پناہ میں آ جانا چاہیے — لیکن یہاں خطبے میں اس سے آگے بڑھ کر یہ دعا کی جا رہی ہے کہ پروردگار! تُو ہمیں ہمارے اپنے ہی نفس کی شرارتوں سے محفوظ فرما۔ درحقیقت اس نفس کے اندر بھی برائی کے محرکات موجود ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیت ۵۳ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں کہ: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ﴾ ''اور مَیں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا' یہ نفس تو برائی سکھاتا ہے مگر جو رحم کیا میرے ربّ نے''۔

انسان کے نفس کے اندر سرکشی ہے اور یہ حدود اللہ کو پھلانگنے کا رجحان رکھتا ہے۔ شیطان اسی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کا اصل کردار یہی ہے کہ غصہ‘ انتقام اور شہوت کے حوالے سے انسانی کمزوریوں کو بھڑکائے اور وسوسہ اندازی کرے۔ سورۃ الاعراف میں یہود کی تاریخ کے ایک بہت بڑے ولی اللہ بلعم بن باعوراء کا ذکر ہے‘ جسے اللہ تعالیٰ نے روحانی اعتبار سے بہت اونچا مقام عطا کیا تھا‘ لیکن پھر اس پر زوال آیا اور سب کچھ چھن گیا۔ اس ضمن میں آیت ۱۷۵ میں فرمایا گیا: ﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿١٧٥﴾﴾ ’’اور انہیں پڑھ کر سنایئے اُس شخص کے احوال کہ جس کو ہم نے اپنی آیات عطا کی تھیں‘ تو وہ خود اُن سے نکل بھاگا‘ پھر شیطان اُس کے پیچھے لگ گیا‘ تو وہ ہوا گمراہوں میں‘‘۔ یعنی نفس کی اکساہٹ کی وجہ سے وہ خود پٹڑی سے اتر گیا۔ چنانچہ جب انسان کے اندر معاملات بگڑتے ہیں تب شیطان فائدہ اٹھاتا ہے۔

☆مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ : ’’جس کسی کو اللہ تعالیٰ ہدایت سے نوازے تو اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا‘ اور جسے وہ گمراہ کر دے تو کوئی نہیں کہ جو اُسے راہِ ہدایت پر لا سکے‘‘۔ یہ بھی قرآن مجید کے حوالے سے ایک بہت اہم اصول ہے جو ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔ ہدایت کا اصل اختیار بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس ہے‘ لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اگر ایک شخص ہدایت کا طالب ہی نہیں تو وہ زبردستی اس کو ہدایت پر نہیں لاتا۔ چنانچہ ہمیں تلقین کی گئی ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں صراطِ مستقیم کی دعا کرتے رہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿٥﴾﴾۔ یہ نہ سمجھیں کہ اگر ہدایت مل گئی ہے تو اب ہمیں اس راستے سے کوئی ہٹا نہیں سکتا۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی سیدھی راہ پر برقرار رکھ سکتا ہے۔

ہدایت اور ضلالت کے قانون کی ایک شق سورۃ الحج کی آیت ۱۶ میں بیان کی گئی کہ: ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿١٦﴾﴾ ’’اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہے‘‘۔ اسی حوالے سے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کے آخر میں ارشاد ہوا: ﴿وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿١٣﴾﴾ ’’اور (اللہ تعالیٰ) ہدایت دیتا ہے اُس کو جو اُس کی طرف متوجہ ہو‘‘۔ اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی کتاب‘ اس کے رسولؐ اور اس کے دین کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ نہیں کہ اس سے تو پیٹھ پھیرے رہیں اور پھر کہیں کہ اللہ نے ہمیں ہدایت ہی نہیں دی۔ جیسے حقیقی رازق اللہ کی ذات ہے‘ لیکن ہم ہاتھ توڑ کے نہیں بیٹھ رہتے‘ بلکہ جو ملتا ہے اُس سے مزید آگے کے لیے دن رات کوشاں رہتے ہیں‘ اسی طرح اگرچہ ہدایت دینے کا آخری اختیار اللہ کے پاس ہے لیکن ہمیں صراطِ مستقیم کا طالب بننا چاہیے اور اللہ کا دامن تھام کر اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ جو شخص خود جاگ رہا ہو اور بظاہر سوتا بن جائے‘ اسے جگانا ممکن نہیں ہے۔ ایسے لوگ جن تک قرآن کی بات پہنچ چکی ہو لیکن پھر بھی وہ اپنے ذاتی مفادات یا کسی اور وجہ سے حق کو قبول نہ کریں‘ ان کی ضلالت پر اللہ تعالیٰ مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے اور پھر کوئی طاقت انہیں راہِ ہدایت پر نہیں لا سکتی۔ یہی اللہ کا قانون ہے!

اس کے بعد خطبہ میں الفاظ ہیں:

☆ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ: ’’اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں‘ وہ اکیلا ہے‘ اس کا کوئی شریک نہیں‘‘۔ یہ توحیدی کلمہ ہے‘ جس کے ذریعے اس امر کی گواہی دی جا رہی ہے کہ اس کائنات میں کوئی قوت نہیں ہے‘ کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے‘ کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے سوائے ایک ذات کے۔ وہ تنہا ہے۔ خدائی اور الوہیت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ یہی بات سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۶ میں ان الفاظ میں آئی ہے: ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ﴾ ’’پس جس نے انکار کیا طاغوت کا اور ایمان لایا اللہ پر‘ تو اس نے مضبوط کنڈے کو تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں‘‘۔ یہاں بھی پہلے اس بات کا مکمل انکار ہے کہ غیر اللہ کے پاس کوئی اختیار اور قدرت ہے۔ کسی کے پاس کوئی اختیار ہے بھی تو وہ جزوی اور اللہ کا عطا کردہ ہے‘ جسے اللہ جب چاہے سلب کر لے۔ کوئی شخص جو بھی عمل کرتا ہے‘ اس کی منظوری اللہ کی طرف سے آتی ہے تو وہ عمل سرزد ہوتا ہے‘ ورنہ ہو ہی نہیں سکتا۔

توحید دین ابراہیمی کا طغرائے امتیاز ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ اور امام الناس قرار دیا۔ وہ عقیدے اور عمل دونوں پہلوؤں سے توحید کے امتحان میں پورے اترے۔ توحید کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور یکتائی کا اقرار کیا جائے' ورنہ کائنات کے خالق کے طور پر تو مشرکین عرب بھی اللہ کو مانتے تھے' لیکن انہوں نے کچھ اور ہستیوں کو چھوٹے معبودوں کا درجہ دے کر اللہ کے اختیار میں شریک کر رکھا تھا۔

اسی حوالے سے بعض خطبات میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ وَحِّدُوا اللّٰهَ فَاِنَّ التَّوْحِيْدَ رَأْسُ الطَّاعَاتِ۔ یعنی اللہ کی توحید کے معاملے میں پوری کوشش کرو کہ کہیں اس کے اندر شرک کی آلائش نہ آ جائے' کیونکہ شریعت میں تمام دینی احکامات کی جڑ بنیاد توحید ہی ہے۔ یہی نہ رہی تو ہمارے اور مشرکوں کے درمیان فرق کیا رہ گیا! لیکن بدقسمتی سے آج مسلمانوں کی صفوں میں وہ لوگ شامل ہیں جو دین توحید میں دراڑیں ڈالتے اور اسے مشرکانہ تصورات سے آلودہ کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۶ میں بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے کہ: ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾﴾ ''اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد اللہ پر ایمان نہیں لاتی مگر ساتھ ہی شرک بھی کرتی ہے''۔ لہٰذا اسلام دین توحید ہے!

☆ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ: ''اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہمارے سردار اور ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس (اللہ) کے بندے اور اُس (اللہ) کے رسول ہیں''۔ یہاں عبد اور معبود کا فرق واضح کر دیا گیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہم اللہ کا ایک بندہ مانتے ہیں' لیکن وہ عبدِ کامل ہیں۔ بقول علامہ اقبال ع ''عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر!'' اس گواہی میں رسالت کا ذکر بعد میں ہے جبکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت عبدیت کو مقدم رکھا گیا ہے۔ معبود تو بس وہی ایک اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ہے' باقی سب اس کے بندے اور غلام ہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک خاص بندے یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خصوصی امتیاز یوں بخشا کہ انہیں منصب رسالت کے لیے یعنی اپنا پیغام نوعِ انسانی تک پہنچانے کے لیے چن لیا۔

جو شخص بھی مذکورہ بالا دونوں گواہیوں کو تسلیم کر لے گا' وہ اللہ کی نگاہ میں صاحب ایمان ہے۔ ان دونوں کے حوالے سے عملی تقاضوں کو سمجھنا بھی ضروری ہے! زبان سے گواہی دینا اپنی جگہ لازم ہے اور اس کی اہمیت بھی ہے' لیکن اس گواہی کی توثیق عمل سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر اللہ کو معبود اور حاکم مانا ہے تو غلام ہونے کے ناطے ہم پر اُس کا ہر حکم واجب التعمیل ہے۔ اور جب اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نمائندہ قرار دے دیا اور یہ فرما دیا کہ میری اطاعت ان کے واسطے سے ہوگی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فرمان واجب الاطاعت ہے۔ اسی کو قرآن بار بار کہتا ہے کہ اگر تم واقعی ایمان والے ہو تو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔ ہر معاملے میں ان کے حکم کے آگے سر جھک جائے۔ یہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے! اسی طرح ریاست کی سطح پر کلمۂ طیبہ کا تقاضا یہ ہوگا کہ وہاں قرآن وسنت کی فیصلہ کن بالادستی کو ہر سطح پر قبول کیا جائے۔

اب خطبہ کا اگلا حصہ آ رہا ہے۔ یہ الفاظ بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے خطبات سے ماخوذ ہیں۔

☆ اَمَّا بَعْدُ: ''اس کے بعد......'' یعنی ایک بات مکمل ہوئی' اب دوسری بات شروع ہو رہی ہے۔ عربی زبان میں یہ خطبہ کا اسلوب ہے اور خطاب کا ایک مستعمل انداز۔

☆ فَاِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ: ''یقیناً بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے''۔ حدیث کے معنی بات' گفتگو' کلام کے ہیں۔ اس مفہوم میں یہ لفظ خود قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۸۵ میں فرمایا گیا: ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾﴾ ''سو اس بات (قرآن) کے بعد یہ کس چیز پر ایمان لائیں گے!'' کیا اب بھی ان پر حق واضح نہیں ہوا؟ اور کون سی شے ہے جو ان پر کارگر ہوگی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام کلاموں میں سب سے اعلیٰ کلام اللہ کا ہے۔

☆وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ: ''اور بہترین راستہ حضرت محمد ﷺ کا راستہ ہے''۔ یہ لفظ ہدیہ یا تحفہ کے معنی میں بھی آ تا ہے' لیکن یہاں اس سے مراد راستہ' طریقہ اور رہنمائی ہے۔ آنحضور ﷺ نے اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے کلامِ الٰہی کی جو عملی شکل واضح کی' اس اُمت کے لیے وہی بہترین طریقہ اور راستہ ہے۔

☆ وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا' وَكُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ : ''اور بدترین معاملات وہ ہیں جو (دین میں) نئی باتیں بنالی گئی ہیں' اور ہر نئی بات بدعت ہے''۔ یہ بہت اہم اور حساس نوعیت کی بحث ہے۔ مُحْدَث کا لفظ بھی حدیث سے بنا ہے۔ حدیث سے مراد زبان سے نکالی گئی کوئی بات یا نیا کلمہ ہے۔ حادثہ یا کسی واقعے کا اچانک رونما ہونا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ دین میں جو نئی باتیں نکالی جائیں' وہ تمام معاملات میں سب سے زیادہ شرانگیز ہیں۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۷ میں رہبانیت کے بارے میں ابْتَدَعُوْهَا کا لفظ آیا ہے جو دراصل بدعت ہی سے فعل ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ ''اور دنیا کا ترک کرنا' جو انہوں (نصاریٰ) نے نئی بات نکالی تھی' ہم نے ان پر یہ (انجیل میں) نہیں لکھا تھا''۔ عیسائیت میں رہبانیت ایک بدعت ہے' جسے ازخود اختیار کر کے دین کا حصہ سمجھ لیا گیا ہے۔

☆وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ' وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ : ''اور ہر بدعت گمراہی ہے' اور ہر گمراہی آگ میں (لے جانی والی) ہے''۔ اس حوالے سے قرآن مجید اور احادیث میں یہ بات آئی ہے کہ اُمتوں میں جب بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو بدعات کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ لوگ ان کاموں کو چونکہ حصولِ ثواب کا ذریعہ سمجھ رہے ہوتے ہیں' لہٰذا ان سے بچنے کا کوئی خیال ان کے ذہن میں آتا ہی نہیں۔ پھر ان بدعتوں کو تحفظ دینے والے بھی بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ علماء یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں جنہوں نے یہ الفاظ خطبۂ جمعہ میں شامل کیے۔ واضح رہنا چاہیے کہ اصل ہدایت وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے واسطے سے دی اور جس پر رسول ﷺ نے عمل کر کے اُمت کو دکھا دیا۔ اس سے آگے اگر کوئی خود قدم بڑھانا چاہے اور دین میں نئے نئے اضافے کرنا چاہے تو وہ کوئی خیر کا کام نہیں کر رہا۔

جب بدعات آتی ہیں تو دین کا حلیہ کیوں بگڑ جاتا ہے' اس کی وضاحت ایک حدیث سے ہوتی ہے جو صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھ سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس کے کچھ نہ کچھ ایسے ساتھی' حواری اور اصحاب نہ ہوں جو اُس رسول کی سنت کو مضبوطی سے تھامتے اور اس کے ہر حکم کی اقتدا کرتے تھے''۔ قرآن و حدیث کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والے سب سے مستند لوگ رسول کے قریبی ساتھی ہوتے ہیں۔ انہوں نے رسول کی سنت کا براہ راست مشاہدہ کیا تھا۔ اگر ان کے عمل میں کہیں کوتاہی ہوتی تو رسول ان کی اصلاح فرماتے تھے۔ لہٰذا اس بات کا فیصلہ کہ کوئی بات دین کا حصہ ہے یا نہیں' ہم اپنی عقل سے نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ہمیں آنحضور ﷺ کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل سے دلیل لانی پڑے گی۔

حدیث مبارکہ کے اگلے حصے میں آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''پھر ایسا ہوتا رہا کہ ہر نبی کے کچھ عرصہ بعد کچھ ناخلف لوگ آ جاتے تھے۔ یہ جو کچھ کہتے تھے اس کے مطابق عمل نہیں کرتے تھے''۔ نااہل لوگ دینی اور روحانی پیشوا بن جاتے۔ ایسے لوگ کلمۂ شہادت کو زبان سے تو ادا کرتے ہیں لیکن اس کا لازمی عملی تقاضا ان کی زندگیوں میں کہیں نظر نہیں آتا۔ چنانچہ پوری زندگی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرنے کے بجائے اپنی مرضی سے اور زمانے کے چلن اور رواجات کے مطابق گزاری جا رہی ہے۔ دین کو تقسیم کر کے کسی نے اس کو مسجد تک محدود کر دیا اور کسی نے محض خدمتِ خلق کو اصل کام قرار دے دیا۔ آج اُمت قول و فعل کے اسی تضاد میں مبتلا ہے۔ دوسری بات آنحضور ﷺ نے فرمائی: ''اور وہ کچھ کرتے تھے جس کا انہیں حکم نہیں ہوا''۔ چنانچہ نئی نئی چیزیں ایجاد کر کے اُن کو دین کا حصہ بنا دیا گیا۔

اس کے بعد کے الفاظ یہ ہیں کہ:((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''جو ایسے لوگوں سے قوت کے ساتھ جہاد کرے وہ مؤمن ہے''۔ یہ طبقہ اگر حکمرانوں کا ہو تو اُن کے خلاف جہاد کے لیے یہ حدیث بنیاد ہے۔ تاہم مسلمان حکمران کے خلاف خروج کی کچھ شرائط بھی ہیں' جو ایک الگ موضوع ہے۔((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ))''اور جو اپنی زبان سے ان لوگوں کے خلاف جہاد کرے وہ مؤمن ہے''۔((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور جو اپنے دل سے ان کے خلاف جہاد کرے وہ مؤمن ہے''۔ یعنی جو دل سے اُن چیزوں کو برا جانے اور ان کے خلاف ایک شدید گھٹن محسوس کرے وہ بھی مؤمن ہے۔((وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))''اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے''۔ یعنی دل میں کڑھن محسوس کرنا ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کو چھوڑ کر اگر دین میں نئی چیزیں نکالی جائیں گی تو وہ شکل و صورت میں چاہے عبادات محسوس ہوتی ہوں' حقیقت میں دینی اعتبار سے انتہائی مہلک ہیں۔

یہ درحقیقت ایک مسلمان اُمت کے زوال کی علامتیں ہیں' جن کا ایک نفسیاتی سبب بھی ہے کہ جب ہم اپنی ایمانی اور عملی کمزوری کے باعث پورے دین پر عمل نہیں کر رہے ہوتے اور اس کے بہت سارے گوشے اپنی عملی زندگی سے خارج کر دیتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے دل کی تسلی کے لیے دینی انداز کی کچھ ایسی چیزیں درکار ہوتی ہیں جن کی ظاہری شکل وصورت عبادات کی طرح ہو۔ اس نفسیاتی ضرورت کی وجہ سے بدعات کو فروغ ملتا ہے اور یہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں' لیکن ان کی وجہ سے دین کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ یہ بات جس نے بھی کہی' حق کہی ہے کہ جب کوئی بدعت آئے گی تو کوئی نہ کوئی سنت رخصت ہوگی۔ بدعات کا معاملہ عقائد میں بھی ہے اور عبادات ورسومات کے اندر بھی!

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں ایجاد ہونے والی روزمرہ استعمال کی جو نئی نئی چیزیں کام میں لائی جاتی ہیں' یہ بھی چونکہ آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دَور میں نہیں تھیں' لہٰذا ان کا شمار بھی بدعات میں ہونا چاہیے۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ نئی نئی ایجادات سے فائدہ انہیں دین کا حصہ سمجھ کر اور ثواب کی نیت سے نہیں اٹھایا جاتا' بلکہ یہ تو دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے برتنے کی چیزیں ہیں۔ کوئی شخص گھر میں فریج یا اے سی کا استعمال ثواب کے لیے تو نہیں کر رہا ہوتا۔ اصل میں سارے بگاڑ کا آغاز اُس وقت ہوتا ہے جب کسی ایسے کام کو دین کا حصہ سمجھ کر ثواب کے حصول کی خاطر کیا جائے جس کا سراغ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کے دَور میں نہ ملتا ہو۔ ایسی چیزیں جب بڑھتی ہیں تو پھر بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں اور معاشرے میں ایک لازم شے کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ پھر جو شخص انہیں اختیار نہیں کرتا' اسے مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے دین میں سنت رسول ﷺ کے حوالے سے کسی شخص کے انتقال کے بعد اہم ترین شے اُس کی نمازِ جنازہ اور تدفین ہے اور اس کے بعد ایک اجتماعی دعا بھی سنت سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ کسی رسم اور تقریب کا کوئی ثبوت نہیں۔ لیکن آج اکثر لوگوں کو نمازِ جنازہ تو یاد نہیں ہے جبکہ سوئم اور چالیسویں کی مجالس میں شرکت لازمی تصور کی جاتی ہے۔ یہ سب چیزیں بعد کے دَور کی پیداوار اور ہندوانہ پس منظر کی حامل ہیں۔ چنانچہ اصل شے غائب ہوگئی جبکہ بدعات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ان بدعات کی وجہ سے مرنے والے کے لواحقین پر خرچ کا بے پناہ بوجھ پڑتا ہے جو قطعی طور پر ناروا اور ناجائز ہے' جبکہ ان کا اصل ''فائدہ'' صرف ان نام نہاد مذہبی طبقات کو ہوتا ہے جنہوں نے دین کو پیٹ کا دھندا بنا رکھا ہے اور جو دین کے نام پر غریب عوام کا بدترین استحصال کرتے ہیں۔ آنحضور ﷺ اس نوع کے تمام ناروا بوجھوں سے نوعِ انسانی کو نجات دلانے آئے تھے لیکن ہم نے رسومات کا ایک طومار گھڑ کر دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ سورۃ المائدۃ کی تیسری آیت کی رُو سے قرآن نے اس امر کی توثیق کر دی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے جو دین دنیا کو دیا' وہ ہر اعتبار سے پورا ہے۔ لہٰذا جو کوئی بھی اس میں کسی قسم کے اضافے کی کوشش کرے گا' وہ دین کا حلیہ بگاڑے گا۔

# تذکیر بالقرآن

خطبہ جمعہ کے متذکرہ بالا مسنون کلمات کے بعد کچھ آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یہاں کوئی ایک سورت یا رکوع بھی تلاوت کیا جا سکتا ہے یا کوئی جامع آیت ہونی چاہیے جس میں پورا ایک پیغام موجود ہو۔ یہ خطبہ کا لازمی جزو ہے' اس لیے کہ آنحضور ﷺ کا خطبہ تو گھومتا ہی آیاتِ قرآنی کے گرد تھا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو خطبات جمعہ مرتب کیے اور جو بہت مقبول بھی ہوئے' ان میں انہوں نے سورۃ المؤمن کی ۶۰ ویں آیت خصوصیت کے ساتھ شامل کی ہے اور خطباء حضرات عام طور پر اسی کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ بڑی گھمبیر' جامع اور اہم آیت ہے جو ایک اعتبار سے دین کا خلاصہ ہے۔ انفرادی سطح پر ایک شخص کے لیے دین کی راہنمائی کا لبّ لباب بہت جامعیت کے ساتھ اس ایک آیت میں آ گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

☆ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ: ''اور کہا تمہارے رب نے مجھ کو پکارو' میں تمہاری پکار کو پہنچوں گا''۔ یہ اصل میں بندگی کی بنیاد ہے کہ دعا کی جائے اور صرف اللہ ہی کو پکارا جائے۔ اسی لیے نماز کی ہر رکعت میں ہم اللہ سے یہ قول وقرار اور عہد کرتے ہیں کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ یعنی پروردگار! ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے' اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے! جس معاملے میں بھی مدد واعانت کی ضرورت ہو' ہم تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ مفہوم عبادت کا لازمی حصہ ہے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) یعنی دعا عبادت کا جوہر ہے۔ عبادت کا ایک ظاہر ہوتا ہے' جیسے نماز کی ہیئت میں ایک خاص انداز سے کھڑے ہونا' رکوع وسجود' قعدہ اور جلسہ شامل ہیں' لیکن اس کا مغز اور جوہر اللہ سے التجا کرنا' اس سے مناجات اور اسے پکارنا ہے۔ ایک دوسری حدیث کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) یعنی دعا ہی عبادت ہے۔ چنانچہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کوئی شخص جب مشکل وقت آئے تو رجوع کس کی طرف کرتا ہے! ظاہری اسباب ووسائل کے حوالے سے بعض اوقات ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا کام فلاں شخص کے ہاتھ میں پھنسا ہوا ہے' چنانچہ اس تک رسائی کے لیے ہم تگ و دو کرتے ہیں —— جبکہ بندگی کا حاصل یہ ہے کہ سب کچھ پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں ہر حال میں اللہ ہی سے رجوع کرنا چاہیے۔ وہی راستہ کھول سکتا ہے۔

آنحضور ﷺ کا فرمان ہے کہ لوگوں کے دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کے درمیان ہیں' وہ جس طرف چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ اُسی کی ذات مسبّب الاسباب اور مشکل کشا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کر دیا کہ مجھ ہی سے فریاد کرو' میں تمہاری دعا کو سنوں گا۔

دعا کی قبولیت کے بارے میں حدیث میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ قبولیت کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ اگر دنیا میں دعا کی قبولیت کا خود اللہ تعالیٰ کے ہاں فیصلہ نہ ہو تو وہ ایک انسان کے لیے توشۂ آخرت بن جاتی ہے۔ لیکن بندگی کا حاصل یہی ہے کہ دعا اللہ ہی سے کی جائے' کسی اور کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا جائے۔

☆ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ: ''بے شک جو لوگ میری بندگی سے تکبر کرتے ہیں (اور تکبر کی بنیاد پر مجھ سے دعا نہیں کرتے) تو عنقریب وہ جہنم میں ذلیل ورسوا ہو کر داخل ہوں گے''۔ ان الفاظ میں بڑا اجلال ہے۔ یہ بھی انسان کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی ایک کیفیت ہوتی ہے کہ میں اپنے مسائل خود حل کر سکتا ہوں۔ میرے پاس دولت ہے اور میری ایک حیثیت ہے۔ چنانچہ اللہ سے دعا کرنے میں بھی اسے حجاب محسوس ہوتا ہے۔ یہ بے توفیق لوگ ہوتے ہیں۔ خود اعتمادی کا یہ درجہ فرعونیت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے فرعونوں کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن پھر جب انہیں اچانک ہی کوئی ایسی بیماری آ پکڑتی ہے کہ جس کا کوئی علاج نہیں ہوتا تو پھر ان کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب وقتی طور پر انہیں کچھ حیثیت دے دی تو ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ بندگی کی حقیقت یہی ہے کہ انسان کسی بھی مقام پر پہنچ جائے' اس کا ظاہر اور باطن اللہ کے

سامنے سربسجود رہے۔ یہی شان سورۃ الکہف میں ذوالقرنین کے قصے میں بیان ہوئی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کے وسائل فراہم کیے تھے لیکن وہ اس مقام پر پہنچ کر بھی رب کے آگے جھکنے والا تھا۔ اس میں تواضع تھی کہ میں اپنی سی کوشش تو کر رہا ہوں لیکن ہوگا وہی جو میرا رب چاہے گا۔ یہ ہے بندگی کا انداز! دوسری انتہا یہ ہے کہ انسان کو کچھ مل جائے تو پھر وہ خدائی کا دعویٰ کرنے لگے۔

ہونا یہ چاہیے کہ اس آیۂ مبارکہ کے علاوہ خطبہ میں جو آیات پڑھی جائیں‘ ان کی مناسبت اس موضوع سے ہو جس پر اردو میں خطاب کیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ سورۃ الجمعہ کے آخری رکوع کی تلاوت ہوسکتی ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کی تلاوت بھی کی جاسکتی ہے۔ یہ اس اعتبار سے قرآن مجید کی جامع ترین آیت ہے کہ پورے نظام کو اللہ کی بندگی کے تابع کیا جائے‘ جبکہ سورۃ المؤمن کی آیت ۶۰ اس حوالے سے اہم ہے کہ ایک فرد کیسے پوری طرح اللہ کا بندہ بنے!

سورۃ الحدید کی اس آیت کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ پورا اجتماعی نظام توحید کے تابع ہو‘ اسلام کا نظامِ عدل وقسط قائم ہو‘ اللہ ہی کی الوہیت اور حکمرانی تسلیم کی جائے‘ آسمانی ہدایت کو اپنی عقل کے اوپر مقدم رکھا جائے‘ اللہ کے ماننے والے دینِ حق کو قائم کرنے کی ذمہ داری کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کو قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ انقلاب کسی اجتماعی نظام کو بدل دینے کا نام ہے۔ انقلابی عمل میں وعظ‘ نصیحت‘ تلقین‘ تعلیم‘ تبلیغ‘ یہ سب اپنی جگہ پر بہت ضروری ہیں‘ اس کا نقطۂ آغاز یہی ہے‘ لیکن اس کے بعد ایک مرحلہ آتا ہے جہاں طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے انسان جھجکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قتل وخون ریزی کوئی اچھی بات نہیں‘ طاقت اور اسلحہ کا استعمال کوئی مستحسن کام نہیں۔ لیکن قرآن مجید نے اس آیۂ مبارکہ میں اس تلخ حقیقت کو بالکل عریاں انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کی انقلابی آیات میں بلند ترین مقام سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کو حاصل ہے۔ یہ ان آیات میں سے ہے جن سے آج یہود ونصاریٰ بہت زیادہ خائف ہیں۔ ان کا بس چلتا تو کبھی کے اس آیت کو قرآن مجید سے نکال چکے ہوتے (معاذ اللہ)۔ ہر اسلامی ملک کے اندر ان کے جو ایجنٹ بیٹھے ہوئے ہیں‘ ان کے ذریعے وہ یہ کوشش تو کر رہے ہیں کہ اس مضمون کی آیات کو نصابِ تعلیم سے خارج کرائیں‘ قرآن سے نکالنے کا امکان تو ہے نہیں‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

☆ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ: ”ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر۔“ جیسے سورۃ المؤمن کی آیت ۶۰ کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا کہ ”اور تمہارا ربّ کہتا ہے“ اسی طرح یہاں بھی اللہ تعالیٰ ہی انسانوں کے ساتھ اپنے ایک خاص معاملے کا ذکر فرما رہے ہیں کہ ہم ہی رسولوں کو بیّنات دے کر بھیجتے رہے ہیں۔ بیّنات سے مراد کھلی‘ واضح‘ روشن تعلیمات بھی ہیں اور اس کے مفہوم میں معجزات بھی شامل ہیں جن کو دیکھنے سے آنکھیں کھلتی ہیں۔

☆ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ: ”اور ہم (رسولوں کے ساتھ) نازل کرتے رہے ہیں کتاب بھی اور میزان بھی۔“ یہی دو الفاظ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۷ میں بھی آئے ہیں کہ: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ﴾ ”اللہ وہ ہے جس نے نازل فرمائی کتاب حق کے ساتھ‘ اور میزان بھی“۔ ”میزان“ کے لیے قرآن مجید میں دوسرا لفظ ”دین حق“ آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۳۳‘ سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ اور سورۃ الصّف کی آیت ۹ میں آنحضور ﷺ کے لیے فرمایا گیا کہ: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ”وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو الھدیٰ اور دین حق دے کر بھیجا۔“ یہاں لفظ ”الکتاب“ کی جگہ ”الھدیٰ“ آیا‘ یعنی ہدایتِ کاملہ‘ مکمل ہدایت‘ جس سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ ”میزان“ کی جگہ لفظ ”دینِ حق“ ہے۔ دین کو ہم نظامِ عدل وقسط کہیں گے‘ یعنی وہ قوانین جو انسان کی ذات سے متعلق ہیں‘ اُن کے درمیان باہم حقوق وفرائض کی تقسیم بالکل درست اور منصفانہ ہے۔ دین کے تحت انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں گوشے آجاتے ہیں۔ سچا دین دنیا میں زندگی گزارنے سے متعلق ضابطۂ حیات ہے۔ عدل وانصاف کے اصول اور معاشرے کے لیے درست اقدار کا تعین‘ جائز وناجائز اور حرام وحلال میں واضح امتیاز قائم کرنا‘ اسی طرح ظلم واستحصال کرنے والے طبقات کو قرارِ واقعی سزا دینے کا نظام قائم کرنا دراصل دینِ حق کا اصل موضوع ہے۔

اسی کے لیے لفظ میزان آیا۔ یعنی نظام درحقیقت حقوق وفرائض کے ایک توازن کا نام ہے۔ افراد جب مل کر رہیں گے تو ایک طرف فرد کی آزادی ہے‘ جبکہ دوسری طرف فرد کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ ان کے مابین توازن مطلوب ہے کہ کسی نظام میں میری آزادی اتنی نہ بڑھ جائے کہ دوسرے لوگوں کی آزادی متاثر ہونے لگے۔ ایک خاص طبقے کو حق اتنا زیادہ نہ دیا جائے کہ دوسرے طبقات کا حق غصب ہونے لگے۔ مَرد کو وہ حقوق نہ دے دیے جائیں کہ پھر خواتین کے حقوق متاثر ہوں‘ یا خواتین کو وہ حقوق نہ دے دیے جائیں کہ مَرد کے حقوق تلف ہوتے ہوں۔ مرد اور عورت اگرچہ ایک ہی جنس کی دو اصناف ہیں لیکن دونوں میں فرق ہے۔ دونوں کو بالکل برابر حقوق دے دینا بھی غیر فطری ہے۔ اس امر کا تعین کون کر سکتا ہے کہ کس کا کیا حق ہے اور کس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اس سوال کے جواب کو منطقی طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام اگر مرد کرے گا تو وہ عورت کے نفسیاتی تقاضوں‘ جذبات اور میلانِ طبع سے مکمل طور پر واقف نہ ہونے کی وجہ سے لازماً ایک ایسا نظام بنائے گا جس میں مرد کے حقوق زیادہ رکھے جائیں گے۔ اسی طرح عورت کو اگر نظام بنانے کا اختیار مل جائے تو وہ بھی عدل کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر رہے گی۔ چنانچہ ایک ہی ذات ایسی ہے کہ جو عدل وانصاف کے ساتھ دونوں کے فرائض اور حقوق کا صحیح صحیح تعین کر سکتی ہے ——— اور وہ ہے جس نے ان دونوں کو پیدا کیا۔ سورۂ ق کی آیت ۱۶ میں فرمایا گیا کہ: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ﴾ ’’اور ہم نے انسان کو تخلیق کیا اور ہم جانتے ہیں کہ اس کا نفس کیا وسوسہ اندازی کرتا ہے۔‘‘ چاہے مرد ہو یا عورت‘ انسان کی نفسیات کو سب سے بہتر جاننے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے‘ جو العلیم ہے‘ جو خالق ہے۔ لہٰذا ایک ایسا میزان یا دینِ حق جس میں ہر ایک کو اس کا جائز حق ملے‘ صرف اللہ ہی عطا کر سکتا ہے۔

اسی طرح فرد اور اجتماعیت کے اندر توازن کا معاملہ بھی وہی خالق ومالک ہی طے کر سکتا ہے۔ دنیا میں کہیں تو ملوکیت اور آمریت اپنے پنجے گاڑ لیتی ہے۔ کوئی آمرِ مطلق اقتدار پر مسلط ہو جاتا ہے اور لوگوں کو قطعاً کوئی حقوق حاصل نہیں رہتے۔ نہ انہیں اظہارِ خیال کی اجازت ہوتی ہے‘ نہ وہ جماعت بنا سکتے ہیں۔ اس طرح کی آمریت اور ملوکیت میں فرد کچلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس معاملہ یہ ہوتا ہے کہ مکمل انفرادی آزادی ہوتی ہے جو آج مغرب میں ہے کہ جو چاہے کرو۔ اسے مادر پدر آزادی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرد اور اجتماعیت میں توازن ایک ایسا معاملہ ہے جسے انسان کا خالق ومالک ہی طے کر سکتا ہے۔

انسانی معاشرے میں فرد کی آزادی اور جزا وسزا کے معاملے میں افراط وتفریط ہے۔ اس حوالے سے ایک تصور یہ ہے کہ جس شخص نے جرم کیا‘ وہ اصل میں ذہنی مریض ہے جسے توجہ کی ضرورت ہے۔ اسے ایک بہتر ماحول فراہم کیا جائے‘ جہاں اس کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ چنانچہ جیل کو ایک آسائش گاہ بنا دیا گیا۔ لیکن یہ تجربہ کر کے بھی انسان نے دیکھ لیا کہ جرم پھر بھی کم نہیں ہوئے۔ لہٰذا انسان کا ذہن یا تو ایک انتہا پر جائے گا یا پھر دوسری انتہا پر۔ ان معاملات میں وہ توازن کے راستے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس ضمن میں اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ ایک طرف تو مناسب تعلیم اور درست اقدار کو رائج کرنا چاہیے جو کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری اور علماء کا کام ہے‘ جبکہ دوسری طرف اگر جرم ثابت ہو جائے تو پھر عبرتناک سزا دی جائے۔ اس کے نتیجے میں معاشرہ بالکل درست ہو جائے گا! ایسا توازن صرف اللہ ہی عطا کر سکتا ہے۔ لہٰذا دینِ حق وہ ہے جس میں ہر ایک کو اس کا جائز حق ملے اور پھر وہ دوسرے کے حق پر ڈاکہ نہ ڈال سکے۔ اگر وہ ایسا کرے تو قانون کی زد میں آئے اور اس کو قرار واقعی سزا دی جائے‘ جبکہ جس کے ساتھ ظلم ہوا ہو‘ اسے انصاف مہیا کیا جائے۔ اسی کا نام میزان ہے۔

الکتاب یعنی آسمانی ہدایت کا اصل حاصل یہ ہے کہ واضح ہو جائے کہ تم کون ہو‘ تمہارا خالق کون ہے‘ اس کی صفات کیا ہیں‘ تمہاری منزل کیا ہے‘ خیر کیا ہے‘ شر کیا ہے‘ حقیقت کیا ہے‘ شیطنت کیا ہے‘ شرک کیا ہے‘ توحید کیا ہے! اس کے ساتھ ساتھ عملی ہدایت کا ایک گوشہ یعنی میزان الگ کر دیا گیا‘ جو کہ عدل وقسط کا اجتماعی نظام ہے۔ اس کی رُو سے معاشرتی سطح پر سب انسان برابر ہیں۔ بحیثیت انسان کوئی اونچا یا نیچا نہیں ہے بلکہ سب کا خالق ایک اللہ

ہے۔ آدم اور حوا کی اولاد ہونے کے ناطے ان سب کے حقوق برابر ہیں۔ پیدائشی طور پر کوئی مراعات یافتہ طبقہ نہیں ہے۔ یہ نظام حضرت محمد ﷺ نے قائم کر کے دکھایا تھا اور دشمنوں نے بھی گواہی دی کہ واقعتاً جو بات آپؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمائی تھی کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی سرخ رو کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں ہے' تو یہ صرف الفاظ نہیں تھے بلکہ اس بنیاد پر عملاً ایک معاشرہ قائم کر کے دکھایا گیا۔ یہ نظام سماجی اور معاشی ہر سطح پر کامل عدل کا ضامن ہے۔ زندگی کی دوڑ میں ہر ایک کو یکساں مواقع فراہم ہونے چاہئیں۔ ملکی وسائل اور دولت کو تمام طبقات میں یکساں طور پر گردش کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ دولت سرمایہ داروں کے طبقے ہی سے نکلے اور گھوم پھر کر وہیں لوٹ جائے جبکہ دوسرے تمام طبقات محروم رہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر: ۷) یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص کی صلاحیت ایک جیسی نہیں ہے۔ کوئی اس موقع پر فائدہ اٹھائے گا اور آگے نکل جائے گا جبکہ کوئی پیچھے رہے گا' لیکن مواقع تو سب کو یکساں حاصل ہوں۔ یہ معاشی عدل کا تقاضا ہے۔

اسی طرح سیاسی عدل کے لیے ضروری ہے کہ سب کے یکساں حقوق ہوں۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا کفو (ہم پلہ) ہے۔ اس معنی میں قانونی حق کے اعتبار سے سب یکساں ہیں۔ اس میں اگر فرق آئے گا تو ایک اسلامی ریاست میں بعض پہلوؤں سے مسلمان اور غیر مسلم کا ہوگا' لیکن مسلمان سب یکساں ہیں۔ اسی طریقے سے یہ بات بہت اہم ہے کہ خلافت کسی کا پیدائشی حق نہیں بلکہ یہ امر المسلمین ہے' یعنی مسلمان مل کر اپنے میں سے ایک خلیفہ کا تعین کریں۔ تمام مسلمانوں کو اس پر یکساں حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے سے کسی کو خلیفہ کے طور پر منتخب کریں۔ کسی ایک طبقے کو پیدائشی طور پر یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کا مستحق ہو کر بیٹھ جائے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہوا سے فوری اور سستا انصاف میسر ہو۔

آیت کا اگلا حصہ بہت اہم ہے۔

☆ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ : ''تاکہ لوگ عدل وقسط پر قائم ہو جائیں۔'' بین السطور میں یہ ہے کہ رسولوں کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نزول کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس دینِ حق اور میزان کو نصب کیا جائے۔ دینِ حق قائم و غالب ہو۔ یہ ''الکتاب'' اللہ نے اس لیے نہیں دی کہ تم اس کو کبھی کبھی پڑھ لیا کرو۔ کسی عزیز' رشتہ دار' دوست کا انتقال ہو گیا تو ایک سپارہ پڑھ لیا اور ایصالِ ثواب کر کے آ گئے۔ یا یہ کہ خود عمل تو کرنا نہیں ہے لیکن پھر بھی کبھی کبھی ثواب کے لیے پڑھنے میں کیا حرج ہے' آخر ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں تو ملیں گی! الھدیٰ کا صرف یہ مصرف نہیں ہے۔ اللہ نے رسول بھی اس لیے بھیجے' کتاب بھی اس لیے نازل کی اور دینِ حق بھی اس لیے عطا کیا تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہو جائیں۔ اسی نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنے کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ چنانچہ آپ ﷺ سے فرمایا گیا کہ اے نبی! کہہ دیجیے: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ (الشوریٰ: ۱۵) ''مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں!'' یہ میزانِ عدل اس لیے دی گئی تھی کہ اسے نصب کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعت خلافت کے موقع پر فرمایا تھا: ''لوگو! تم میں سے جو قوی ہے میرے نزدیک وہ ضعیف ہوگا جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کرلوں' اور جو ضعیف ہے وہ قوی رہے گا جب تک کہ اسے اس کا حق دلا نہ دوں''۔

اس آیت میں رسولوں کو عطا کردہ تین چیزوں (بیّنات' کتاب اور میزان) کا جو حاصل بتایا گیا ہے وہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس نظام کے قائم ہونے کے نتیجے میں لوگوں کو ایسا ماحول میسر آئے گا جس میں ان کی روحانی ترقی کے امکانات ہوں گے۔ اگر یہ میزان نصب نہیں ہے تو وہ معاشرہ استحصالی معاشرہ ہے۔ اس کے اندر ظلم ہے' چاہے ظاہری طور پر وہ ایک نہایت خوش نما نظام ہو۔

مغرب سے درآمد شدہ جمہوری نظام کی اصلیت کو علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے پہچانا تھا کہ ع چہرہ روشن' اندروں چنگیز سے تاریک تر۔ بظاہر تو یہ بڑا عمدہ نظام ہے' لیکن جن بنیادوں پر یہ اٹھایا گیا ہے وہ اصل میں چنگیزیت ہے۔ اس نظام میں وہی اوپر آ سکتا ہے جس کے پاس سرمایہ ہوگا۔ سرمائے کے ذریعے وہ میڈیا کو بھی خرید سکتا ہے۔ لہٰذا بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ ہم نے اپنے ووٹ سے ایک شخص کو اوپر پہنچایا ہے لیکن درحقیقت ہمارے

ذہن کو آزاد نہیں چھوڑا گیا بلکہ یہ ذرائع ابلاغ سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ جس کے پاس سرمایہ نہیں ہے‘ وہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ اس کے مظاہر آج ہم پوری دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔

اسی طرح سودی بنیادوں پر قائم معاشی نظام کو سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے اور ظاہراً یہ بڑا خوشنما نظر آتا ہے‘ لیکن حقیقت کے اعتبار سے بقول اقبال ؎

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ

آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

اس سودی نظام کے نتیجہ میں انسان حیوانیت سے اتر کر درندگی کی سطح پر آ جاتا ہے۔ سودخور اصل میں درندے ہیں‘ وہ انسان نہیں رہتے۔ وہ مروّت‘ شرافت‘ رحمت اور شفقت کے جذبات سے قطعاً عاری ہوتے ہیں۔ چاہے اپنے پاس اتنا جمع ہو چکا ہو کہ دس پشتیں کھا سکتی ہوں‘ لیکن اس سود کی بنیاد پر وہ غریبوں کے کپڑے تک بیچنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ یہ قانون امریکہ میں سودی نظام کے علمبردار یہودیوں نے بنایا تھا کہ اگر ایک شخص دیوالیہ ہو جاتا ہے تو پھر حکومت اس امر کی پابند ہے کہ ان سودخوروں کو ان تمام واجبات کی ادائیگی کرے جو اس شخص کے ذمہ تھے‘ چاہے اس عمل میں اس کا گھر بھی نیلام ہو جائے۔ اسی طرح یہ جو قسطوں پر چیزیں دی جاتی ہیں‘ ان کی ادائیگی اگر وقت پر نہ ہو تو شرح سود میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس جال میں پھنس کر ہر سال لاکھوں افراد دیوالیہ ہوتے ہیں۔ سودخور چاہتا ہے کہ ہر چیز مجھے مل جائے اور میں اپنا حق وصول کرلوں‘ اور حکومت اسے یہ سب کچھ دلوانے کی پابند ہے۔ ہاں دیوالیہ شخص کو زندہ رہنے کے لیے حکومتی سطح پر کچھ بنیادی ضرورتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ لیکن اس طرح حکومت کنگال ہو جاتی ہے‘ جبکہ سودخوروں کے کھتے بھرتے جاتے ہیں۔ بہرکیف‘ یہ سودی نظام حقیقت کے اعتبار سے چنگیزیت اور ابلیسیت ہے۔

ایسے بدترین استحصالی نظام میں انسان کو اللہ‘ اس کے دین‘ روحانیت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا خیال کہاں آئے گا! وہ تو اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی تگ ودو میں لگا رہے گا جبکہ سودخور آگے سے آگے بڑھنے کی دوڑ میں رہیں گے۔ لہٰذا اگر یہ دین حق قائم ہو تو اس کے نتیجے میں انسان اپنے خالق کی طرف رجوع کرنے اور عبدیت کے تقاضے پورے کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ رسولوں کو اسی لیے بھیجا گیا۔

آیت کے اگلے الفاظ نہایت توجہ طلب ہیں:

☆وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ : یہ وہ الفاظ ہیں جو یہود و نصاریٰ کو بہت چبھتے ہوں گے۔ ’’اور ہم نے لوہا اتارا‘ اس میں جنگ کی بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں‘ اور اللہ تعالیٰ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کون ہیں جو اللہ کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں‘ غیب میں رہتے ہوئے۔‘‘

بـأس کا ترجمہ بعض حضرات صرف قوت کر دیتے ہیں کہ ’’اس میں بڑی قوت ہے‘‘ لیکن اس کا حقیقی ترجمہ ’’اسلحہ کی قوت‘‘ ہے۔ اسی لوہے سے تلوار‘ نیزہ‘ ڈھال اور دیگر سامانِ جنگ تیار ہوتا ہے‘ توپ اور ٹینک بھی اسی سے بنتے ہیں۔ فولاد کے کچھ اور کام بھی ہیں اور استعمال کی بہت سی چیزیں اس سے بن سکتی ہیں لیکن اس کا اصل وصف جنگی صلاحیت ہے۔ لوہے کی قوت اس لیے ہے کہ جو طبقات بھی دین حق کے قیام اور اس میزان کو نصب کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنیں‘ ان کی سرکوبی کے لیے اسے ہاتھ میں لو اور ان کے سر کچل دو۔ اس طرح یہ ثابت کرو کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ کے وفادار ہو۔ رب کی دھرتی پر رب کا نظام قائم کرنے کے لیے میدان میں نکل آؤ۔ یہ ہے اصل ہدف جو مسلمانوں کو دیا گیا! نیو ورلڈ آرڈر تاریخ انسانی کا سب سے بڑا شیطانی نظام ہے اور اس کے پیچھے ٹیکنالوجی کی پوری قوت ہے۔ یہی دجالیت کی انتہا ہے‘ جس سے ہر نبی اور رسول نے پناہ مانگی ہے۔ لیکن جو لوگ اللہ اور رسولؐ کے وفادار ہیں‘ ان کی وفاداری کا امتحان یہی ہے کہ وہ نکلیں اور ان طبقات سے نبرد آزما ہوں۔ لوہے کی قوت کو ہاتھ میں لے کر دین حق کے قیام کی ہر رکاوٹ کو دور کریں۔ یہ قرآن مجید کی سب سے بڑی انقلابی آیت ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقِ انقلاب دوٹوک انداز میں بیان فرما دیا گیا ہے کہ ہم نے دلیل اور بیّنہ بھی اتار دی‘ کتاب بھی نازل کر دی اور میزان بھی اتار دی۔ کتاب کی دعوت سے لوگ آپؐ کے قریب آ جائیں گے۔لیکن اب ان کو منظم کر کے ایک طاقت بنانا ہے تا کہ نظامِ باطل سے ٹکرایا جائے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ میزانِ عدل وقسط کو دنیا میں نصب کیا جائے۔ اس آیۂ مبارکہ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا بھر کے انقلابی لٹریچر میں اس سے زیادہ عریاں انقلابی الفاظ کہیں نہیں ملتے!

☆اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ: اور ساتھ ہی فرما دیا کہ یہ واضح رہے کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے‘ زور آور ہے۔'' اس کا اقتدار پوری کائنات اور کون ومکاں کو محیط ہے۔ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) کوئی کمزوری لاحق ہو گئی ہے اور اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ وہ تو القوی ہے‘ بڑی قوت والا ہے‘ العزیز ہے‘ زبردست ہے۔ کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ وہ بے بس ہو گیا ہے اور تم سے مدد کے لیے کہہ رہا ہے۔ اُس کا ایک حرفِ کُنْ آنِ واحد میں یہ نظام تلپٹ کر سکتا ہے‘ لیکن اصل میں تمہارا امتحان پیشِ نظر ہے۔ یہ تمہاری وفاداری کا امتحان ہے۔ ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اس امتحان میں کامیابی کی صورت میں وہ نعمتیں اور آسائشیں ملیں گی جن تک کبھی کسی کے تخیل کی رسائی نہ ہو سکی۔ اس امتحان کے ذریعے اگر دین قائم ہو گا تو نوعِ انسانی کا بھلا ہو گا‘ انہیں عدل وانصاف ملے گا‘ انہیں وہ ماحول میسر آئے گا جس میں وہ انسانیت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو ترقی دے کر حیوان کی سطح سے بلند ہو سکیں گے۔

ابوداؤد کی ایک روایت کے مطابق آنحضور ﷺ اکثر اوقات خطبہ جمعہ میں سورۂ قٓ پڑھا کرتے تھے اور اس کے حوالے سے تذکیر وموعظت فرمایا کرتے تھے۔ اس سورت کا اصل مضمون توحید‘ رسالت اور آخرت کے حوالے سے تذکیر ہے۔ بہرحال اب آگے بڑھتے ہیں۔ تلاوتِ آیات کے بعد پہلے خطبے کے آخر میں یہ دعا ہوتی ہے:

☆ بَارَكَ اللّٰهُ لِي وَلَكُمْ فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ: ''اللہ تعالیٰ اس قرآن عظیم کے حوالے سے میرے لیے اور آپ سب کے لیے برکت پیدا فرمائے!'' خطبے میں جو آیات ہم نے سنی ہیں اور تذکیر وموعظت حاصل ہوئی ہے‘ اللہ تعالیٰ اس میں ہم سب کے لیے برکت پیدا فرمائے اور اسے ہمارے لیے خیر کا ذریعہ بنا دے۔

☆وَنَفَعَنِيْ وَإِيَّاكُمْ بِالْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ: ''اور یہ آیات اور حکیمانہ ذکر میرے لیے بھی اور آپ سب کے لیے بھی نفع بخش ہو''۔ یعنی اب ہم ان آیات سے فائدہ اٹھائیں اور اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنائیں تا کہ یہ ہمارے لیے سودمند ثابت ہوں۔ اس کے لیے بھی اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں اس کی توفیق دے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے‘ جو الحکیم ہے یعنی انتہائی حکمت والا! دنیاوی سطح پر بھی بہت سے لوگوں کو حکیم‘ دانا اور صاحب فراست کہا جاتا ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت اور کسی بڑے سے بڑے عالم یا دانشور کی سمجھ بوجھ کا کوئی موازنہ اور تقابل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم اپنی زندگی میں لوگوں کے اقوال اور فلسفۂ حیات پر عمل کرتے ہیں تو یہ اصل میں خود ہماری محرومی ہے۔ قرآن کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے منبع سے حکمت اور دانائی اخذ کرنے کی کوشش کرنا ہماری اپنی کم نصیبی ہے۔

☆اِنَّهٗ تَعَالٰى جَوَّادٌ كَرِيْمٌ مَلِكٌ بَرٌّ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ: ''یقیناً اللہ تعالیٰ انتہائی جود وسخا والا‘ کرم فرمانے والا‘ بادشاہ‘ محسن‘ مہربان‘ رحم فرمانے والا ہے''۔ اللہ تعالیٰ ایسا سخی ہے کہ جو مانگنے سے خوش ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ہستی ایسی نہیں کہ اس سے مانگا جائے اور وہ اس پر راضی ہو۔ ذاتِ باری تعالیٰ انتہائی کرم فرمانے والی ہے۔ وہ کون ومکان اور ارض وسماوات کا بادشاہِ حقیقی ہے۔ جو اس کے وفادار ہیں‘ وہ ان کی توقعات پر پورا اترنے والا اور انہیں

پورا پورا صلہ دینے والا ہے۔ اس پر توکل کرنے والوں کا وہ مولا اور محافظ ہے۔ رأفت اور رحمت کے الفاظ اصل میں اکٹھے آتے ہیں۔ رأفت سے مراد کسی کے دکھ درد کو محسوس کرنا ہے جبکہ رحمت یہ ہے کہ کسی کی تکلیف محسوس کر کے اس کے ازالے کے لیے کوشش کی جائے۔ اس مفہوم کے حوالے سے اللہ تعالیٰ رؤف بھی ہے اور رحیم بھی!

پہلا خطبہ ان الفاظ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد خطیب کچھ دیر کے لیے بیٹھتا ہے۔ بعض احادیث کی رو سے دونوں خطبوں کے درمیان یہ چند لمحات دعا کی قبولیت کے حوالے سے نہایت معتبر ہیں۔ لہٰذا اس وقفے کے دوران اپنے اپنے طور پر دعا کرنی چاہیے۔

# خطبۂ ثانیہ

جمعۃ المبارک کے دوسرے خطبے کا آغاز اِن الفاظ سے ہوتا ہے:

☆ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى: ''کل تعریف وثنا اور شکر و سپاس اللہ کے لیے ہے' اور وہ (اپنے بندوں کی حاجات کے لیے) کافی ہے''۔ ہمارا وجود اللہ تعالیٰ ہی کی عطا ہے۔ ہماری مادی اور روحانی ضروریات کا پورا کرنے والا بھی وہی ہے۔ لہٰذا اگر ہم ہر لحظہ اس کا شکر ادا کریں تو بھی حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سننے' ان کی مشکل کشائی کرنے اور ان کی حاجت روائی کے اعتبار سے اُسی کی ذات کافی ہے۔ یہ مضمون سورۃ الزمر کی آیت ۳۶ کے آغاز میں بھی بڑے پیارے انداز میں آیا ہے۔ آنحضور ﷺ کو تسلی دی گئی کہ: ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ﴾ ''کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے!'' یعنی اگرچہ حالات انتہائی ناموافق ہیں اور سردارانِ قریش آپؐ کی جان کے دشمن ہو چکے ہیں لیکن اللہ کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر اللہ آپؐ کی پشت پر ہے تو کس بات کا ڈر ہے! اگر دنیا کے تمام طاقتور طبقات اور وقت کے فرعون کسی انسان کے مخالف ہو جائیں تو بھی اللہ تعالیٰ کی ذاتِ واحد اُن سب سے مقابلے کے لیے کافی ہے' لیکن اس کی ایک شرط ہے جو قرآن خود بیان کرتا ہے کہ انسان بھی اللہ کا وفادار بنے اور صرف اُسی پر ایمان رکھے' اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے اور اسی پر توکل کرے۔ یہ دوطرفہ رشتہ ہے' ورنہ اللہ تعالیٰ بھی انسان کو حالات کے حوالے کر دیتا ہے۔ پھر ایسا انسان اللہ کی حفاظت سے محروم ہو جاتا ہے۔

☆ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى: ''اور دعا و سلام ان بندوں پر جنہیں اس (اللہ) نے خود چن لیا''۔ اس سے مراد تمام انبیاء کرام علیہم السلام ہیں۔ انہیں اللہ نے ایک بڑے عظیم مقصد کے لیے چنا۔ وہ سب اللہ کے بندے ہیں اور اسی نے انہیں یہ مقام دیا ہے۔ لہٰذا ان کے لیے سلامتی کی دعا ہے۔

☆ اَمَّا بَعْدُ: ''اس کے بعد''۔ خطاب کے اندر جب ایک مضمون کے بعد دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے تو یہ کلمہ ادا کیا جاتا ہے۔

☆ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ' بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: قرآن مجید کی آیات کی تلاوت سے پہلے تعوّذ پڑھنا واجب کے درجے میں ہے' اس لیے کہ اس کا حکم خود قرآن مجید میں ہے۔ سورۃ النحل کی آیت ۹۸ میں فرمایا گیا: ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿٩٨﴾﴾ ''جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو' تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ میں آ جایا کرو''۔ شیطان کی وسوسہ اندازی سے حفاظت کا ایک ہی راستہ ہے' اور وہ یہ کہ جس ہستی کے تابع وہ ہے اس کی مدد حاصل کی جائے۔ پھر شیطان حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ بصورت دیگر اسے پورا اختیار ہے اور وہ انسان کو گمراہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ چنانچہ قرآنی حکم کے تحت تعوّذ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ ہر اچھے کام کی ابتدا بسم اللہ سے ہونی چاہیے' اس لیے آیاتِ قرآنی کی تلاوت کے آغاز میں بھی بسم اللہ پڑھی جاتی ہے۔

اس کے بعد یہاں خطبۂ جمعہ میں بالعموم سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۶ تلاوت کی جاتی ہے:

☆اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿۵۶﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ اوراس کے فرشتے نبیؐ پر رحمتیں بھیجتے ہیں' اے ایمان والو! تم بھی ان پر رحمت بھیجا کرواور سلام بھیجا کرو جیسے کہ سلام بھیجا جاتا ہے''۔اس آیت میں ذکر ہے نبی کریم ﷺ پر درود وسلام بھیجنے کا۔اللہ کے منتخب کردہ افراد میں آنحضور ﷺ کا ایک خصوصی مقام ہے کہ وہ خاتم النبیین' آخرالمرسلین ہیں اور تمام انبیاء ورُسل کے سردار ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں۔

نسبت کی تبدیلی سے جس طرح لفظ توبہ کے معنی بدل جاتے ہیں' اسی طرح یُصَلُّوْنَ کا ترجمہ بھی نسبت کی تبدیلی کے حوالے سے مختلف کیا جائے گا۔ سورۃ التحریم کی آٹھویں آیت کے شروع میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ: ﴿یٰٓـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا﴾ ''اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں سچی توبہ''۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں بھی ایک نام ''التواب'' ہے۔توبہ کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر کوئی نافرمان اور باغی بندہ اس کی جناب میں رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ رحمت اور شفقت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ لفظ ''توبہ'' اللہ کے لیے بھی استعمال ہو رہا ہے اور بندے کے لیے بھی' لیکن نسبت بدلنے سے اس کا مفہوم بدل گیا۔اسی طرح لفظ صلوٰۃ جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے آئے گا تو علماء نے اس کا مفہوم یہ معین کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضور ﷺ پر مسلسل رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔فرشتوں کی صلوٰۃ کے بارے میں سورۃ المؤمن کی ساتویں آیت میں ذکر ہے کہ: ﴿وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اور وہ سچے اہل ایمان کے لیے استغفار کرتے ہیں''۔ چنانچہ فرشتے نبی کریم ﷺ کے لیے ہر وقت استغفار اور دعائے رحمت کرتے رہتے ہیں۔اہل ایمان کی صلوٰۃ سے مراد یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ پر رحمتوں کے نزول اور ان کے درجات کی بلندی کے لیے پروردگار کی بارگاہ میں دعا کی جائے۔لہٰذا نبی ﷺ پر صلوٰۃ یا درود بھیجنے کا بڑا اونچا مقام ہے۔ یہ نہ صرف بہت بڑی نیکی اور ثواب کا کام ہے بلکہ آنحضور ﷺ سے ہماری محبت کا تقاضا بھی ہے۔

صحیح احادیث میں یہ مذکور ہے کہ صحابہ ؓ نے آنحضور ﷺ سے سوال کیا کہ آپؐ پر سلام بھیجنے کے الفاظ تو ہمیں بتادیے گئے جو نماز کے تشہد میں شامل ہیں' اے اللہ کے رسولؐ! یہ فرمایئے کہ ہم آپؐ پر درود کیسے بھیجیں۔اگرچہ صرف ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہہ دینا بھی درود ہے' لیکن صحابہ کرامؓ کے سوال کے جواب میں جو درود آنحضور ﷺ نے تلقین فرمایا' وہ درودِ ابراہیمی ہے۔یہ سب سے زیادہ فضیلت والا درود ہے جو ہم نماز میں پڑھتے ہیں اور جس کی تلقین خود آنحضور ﷺ نے اُمت کو فرمائی۔ چنانچہ اس آیت کی تلاوت کے فوراً بعد امتثالِ امر کے طور پر خطیب درود پڑھتا ہے۔

☆اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ: ''اے اللہ! رحمتوں کی بارش نازل فرما حضرت محمد ﷺ پر اور آلِ محمدؐ پر''۔

☆ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ: ''جیسے کہ تو نے رحمتوں کی بارش برسائی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور آلِ ابراہیمؑ پر۔''

☆اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ: ''بے شک تو تمام خوبیوں کا مالک اور انتہائی سربلندی والا ہے''۔

☆اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ: ''اے پروردگار! برکتیں نازل فرما حضرت محمد ﷺ پر اور آلِ محمدؐ پر''۔

☆ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ: ''جیسے کہ تو نے برکت نازل فرمائی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور اُن کی آل پر''۔

☆اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ: ''بے شک تو تمام خوبیوں کا مالک اور انتہائی سربلندی والا ہے''۔

لفظ آل کی وضاحت کے ضمن میں صاحب کشاف نے جو تشریح کی ہے' اس کے مطابق آل اور اہل ایک ہی معنی میں ہیں۔اہل کے اندر رشتہ دار بھی شامل ہیں اور سارے متعلقین بھی۔ لہٰذا جو آنحضور ﷺ سے جتنا قریب ہے' وہ اتنا ہی اس میں زیادہ شریک ہے۔لیکن امام رازیؒ نے اس کی جو وضاحت کی ہے' اس کے مطابق لفظ اہل کے اندر زیادہ وسعت ہے' جیسے کسی شہر کے رہنے والوں کو اہل کہا جاتا ہے' جبکہ آل کا تعلق قربت' رشتہ داری

اور مصاحبت سے ہے۔ تو آنحضور ﷺ کا جو سب سے زیادہ قریبی حلقہ ہے‘ چاہے وہ رشتہ داروں کا ہو یا آپؐ کے صحابہ کا‘ وہ سب آل کے اندر شامل ہیں۔

اس کے بعد خطبے میں چوٹی کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر ہوتا ہے۔ آنحضور ﷺ نے بعض صحابہ کا نام لے کر ان کی مدح فرمائی تھی۔ ان میں سے چار کا حوالہ تمام خطباتِ جمعہ میں ضرور دیا جاتا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک خلفائے راشدین کی افضلیت ان کی ترتیب خلافت کے مطابق ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر ہوا۔

☆ اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکْرٍ : فرمایا: ’’میری اُمت میں سے میری اُمت کے حق میں سب سے زیادہ مہربان ابوبکرؓ ہیں‘‘۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو رحمۃٌ للعالمین بنایا تو اسی رحمت کا عکس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں تھا۔ ان کی سیرت کے بے شمار واقعات سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں واقعہ بدر کے قیدیوں کے حوالے سے ہے۔ اُس وقت آنحضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے ایک ہی تھی کہ ان کے ساتھ نرم معاملہ کیا جائے اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے‘ یا یہ کہ کوئی قیدی کسی مسلمان کو پڑھا دے تو اسی کو فدیے کے طور پر قبول کر لیا جائے۔

☆ وَ اَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ عُمَرُ: ’’اور اللہ (کے دین) کے معاملے میں سب سے زیادہ سخت عمرؓ ہیں‘‘۔ جب احکاماتِ دین یا غیرتِ دین کا معاملہ ہو تو سب سے زیادہ سخت اور بے لچک موقف رکھنے والے صحابیٔ رسولؐ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے خلیفہ اور جانشین کے طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا تو ان کی طبیعت میں سختی کے حوالے سے بعض صحابہ نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے انہیں تسلی دی تھی کہ جب حضرت عمرؓ پر خلافت کا بوجھ پڑے گا تو یہ سختی اعتدال پر آ جائے گی۔ دین کے معاملے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سخت مزاجی کے بہت سے واقعات ہیں‘ جن میں سے ایک کا ذکر قرآن مجید میں سورۃ النساء میں ہوا ہے۔ کسی منافق کا ایک یہودی سے کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ یہودی چونکہ حق پر تھا‘ اور یہ جانتا تھا کہ اللہ کے رسول انصاف سے فیصلہ کریں گے‘ اس لیے وہ منافق کو کھینچ کر حضور ﷺ کی عدالت میں لے گیا۔ آنحضور ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس پر منافق نے کہا کہ اسے یہ فیصلہ منظور نہیں‘ حضرت عمرؓ کے پاس چلتے ہیں۔ چنانچہ وہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آ گئے۔ جب حضرت عمرؓ کو یہ معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ فیصلہ دے چکے ہیں جسے منافق نے قبول نہیں کیا‘ تو انہوں نے تلوار نکالی اور یہ کہتے ہوئے اس منافق کا سر قلم کر دیا کہ جسے اللہ کے رسول ﷺ کا فیصلہ منظور نہیں اس کے لیے پھر یہی فیصلہ ہے۔

☆ وَاَکْثَرُھُمْ حَیَآءً عُثْمَانُ: ’’اور ان میں سب سے زیادہ باحیا عثمانؓ ہیں‘‘۔ شرم وحیا انسان کی شخصیت کا ایک خوبصورت رنگ ہے اور نہایت قابل قدر وصف ہے جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو انتہائی ممتاز مقام حاصل تھا۔

☆ وَاَقْضَاھُمْ عَلِیٌّ: ’’اور ان میں سب سے بڑھ کر درست فیصلہ کرنے والے علیؓ ہیں‘‘۔ یعنی معاملات کی سمجھ بوجھ کے حوالے سے سب سے زیادہ صاحب صلاحیت شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

یہ وہ سرٹیفیکیٹس ہیں جو آنحضور ﷺ نے اپنے قریبی صحابہ کو عطا کیے۔

اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدح میں کبھی کبھی ایک حدیث اور بھی یہاں پڑھی جاتی ہے‘ جو مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرتب کردہ خطبات میں شامل ہے۔ صحابہ کرام کی فضیلت اور مرتبے کے حوالے سے یہ بہت اہم حدیث ہے۔ فرمایا:

☆ اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِیْ: ’’میرے اصحاب کے معاملے میں اللہ کا خوف کرو‘ میرے بعد تم انہیں تنقیص کا نشانہ مت بنانا‘‘۔ یہ درست ہے کہ صحابہ بھی معصوم نہیں ہیں‘ کسی اجتہادی معاملے میں ان سے غلطی ہو سکتی ہے‘ لیکن ان پر بدنیتی کا شبہ کرنا ان کی توہین وتنقیص ہے۔ ویسے بھی اجتہادی معاملے میں غلطی گناہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر‘ خلافت سنبھالتے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ

جیش اُسامہ کو' جسے آنحضور ﷺ نے اپنی حیات کے آخری ایام میں تیار کیا تھا' بھیجا جائے یا روکا جائے۔ بعض صحابہ کی رائے یہ تھی کہ اسے نہیں جانا چاہیے' کیونکہ ابھی بہت سے فتنے سر اٹھا رہے ہیں اور معاملات کو سنبھالنے میں دیر لگے گی۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کر دیا کہ آنحضور ﷺ کا تیار کردہ یہ لشکر ہر صورت میں جائے گا۔ اس قسم کے فیصلوں کے بارے میں دو آراء ہو سکتی ہیں کہ یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط' لیکن بہرصورت اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ جب ایک شخص خلوص سے کوئی اجتہادی فیصلہ کرتا ہے تو اس پر بھی اجر ہے' چاہے نتیجہ کے اعتبار سے وہ غلط ہو جائے۔ علمی طور پر تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں وقت فلاں صحابی سے اجتہادی طور پر غلطی ہوئی' لیکن تنقیص یہ ہے کہ ان کی نیت پر حملہ کیا جائے۔ اس کی اجازت نہیں ہے۔ جب قرآن نے یہ گواہی دے دی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان کو اتنا راسخ کر دیا ہے کہ کفر' گناہ اور فسق سے ان کو طبعاً کراہت ہو چکی ہے' اس طرف ان کا اب رجحان ہی نہیں ہے تو اُن پر بدنیتی کا حملہ کرنا ایمان کے منافی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے تربیت یافتہ افراد ہیں۔ اُن پر الزام تراشی دراصل توہین رسالت سے کم نہیں۔ اس ضمن میں انتہا یہ ہے کہ کوئی ظالم ان کو غاصب اور منافق کہے!

اسی حدیث کے اگلے الفاظ یہ ہیں:

☆فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ: ''جو اُن سے محبت رکھتا ہے' وہ میری محبت کی وجہ سے اُن سے محبت رکھتا ہے''۔

☆وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ: ''اور جو اُن سے بغض رکھتا ہے' وہ میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے''۔ یعنی اس کا اصل بغض مجھ سے ہے۔ اس حدیث مبارکہ کی رو سے یہ واضح ہو گیا کہ جو لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قدر کرتے ہیں' وہ دراصل حضور ﷺ سے محبت کرنے والے ہیں اور جو اُن سے بغض رکھیں' ان کی نیتوں پر حملہ کریں' انہیں اپنے لاشعور میں جھانکنا چاہیے۔ اصل بغض انہیں حضور ﷺ سے ہے' جس کا غصہ وہ صحابہ کرامؓ پر نکال رہے ہیں۔

اس کے بعد خطبے میں جو حدیث آپ بالعموم سنتے ہیں' اس کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ آنحضور ﷺ نے اپنے خطبہ میں یہ الفاظ ادا نہ کیے ہوں۔

☆لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ: یہ بہت جامع حدیث ہے۔ ''جس شخص کے اندر دیانتداری کا وصف نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں۔ اور جس کے اندر عہد کی پاسداری نہیں اس کا کوئی دین نہیں''۔ یہ ایمان اور دین کو ناپنے کا ایک نہایت مؤثر پیمانہ ہے جو حضور ﷺ نے مقرر فرمایا۔ اسے ہر شخص اپنے اوپر لاگو کرے' دوسروں پر نہیں۔ امانت داری کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص آپ کو امین سمجھ کر ایک چیز آپ کے پاس رکھوا رہا ہے' اب اگر آپ اس میں خیانت کرتے ہیں تو گویا آپ یہ سمجھ کر ایسا کر رہے ہیں کہ ایسی کوئی ہستی نہیں ہے جو آپ کے اس عمل کو دیکھ رہی ہو اور آپ کی پکڑ کر سکے۔ اگر اللہ پر اور آخرت پر ایمان ہے تو یہ بے ایمانی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا امانت میں خیانت فی الاصل ایمان ہی کی نفی ہے۔ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی نے پیسے یا کوئی قیمتی اثاثہ آپ کے پاس رکھوا دیا' بلکہ ذمہ داری کے مناصب بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ کسی بھی منصب کا حلف اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ پوری ذمہ داری' ایمان داری اور غیر جانبداری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کیے جائیں۔ اس میں اقربا پروری' سفارش' رشوت' کوتاہی کا عمل دخل بالکل نہ ہو۔ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو پھر امانت میں خیانت ہو رہی ہے۔ آنحضور ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا کہ جس شخص سے آپ مشورہ طلب کرتے ہیں' وہ بھی صاحب امانت ہے۔ اس پر اعتماد کر کے آپ نے اسے امین بنایا ہے۔ اب اس امانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ واقعتاً پوری سنجیدگی سے غور و فکر کر کے جو چیز آپ کے لیے بہتر سمجھے' وہی مشورے کے طور پر پیش کرے۔

عہد کی پاسداری کے حوالے سے یہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارا دین تو نام ہی عہد کا ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان یہی عہد ہے جس کو ایک اور انداز میں سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱ کے آغاز میں خوبصورتی سے بیان کیا گیا کہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ ''اللہ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے''۔ اللہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اب یہ جان اور مال اللہ کی مرضی کے مطابق اور اس کے دین کی خدمت کے لیے لگیں۔ جو شخص انسانوں کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو پورا نہیں کر رہا وہ اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو کہاں خاطر میں لائے گا! چنانچہ یہ ایمان اور دین کے عملی تقاضے ہیں جنہیں نبی کریم ﷺ نے خوبصورتی سے بیان کر دیا۔

خطبے کے آخری حصے میں عام طور پر چند دعائیں شامل ہوتی ہیں۔

☆ اَللّٰهُمَّ انْصُرِ الْاِسْلَامَ وَالْمُسْلِمِيْنَ: ''اے اللہ! نصرت فرما اسلام کی اور مسلمانوں کی بھی''۔

☆ اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَاجْعَلْنَا مِنْهُمْ: ''اے اللہ! ہر اُس شخص کی مدد فرما جو حضرت محمد ﷺ کے (لائے ہوئے) دین کی مدد میں لگا ہوا ہے اور ہمیں بھی ان میں شامل فرما''۔ جو لوگ بھی دینِ حق کو پورے کرۂ ارضی پر قائم کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں، وہ سب اس دعا میں شامل ہیں۔ دعا کے آخری الفاظ بتا رہے ہیں کہ دعا کرنے والے کا اپنا ارادہ اور نیت بھی ہونی چاہیے کہ وہ بھی ایسے لوگوں کے ساتھ شامل ہو کر اللہ اور رسولؐ کے دین کی نصرت کے اس عظیم مشن میں اپنا حصہ ڈالے اور اس راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی امکانی کوشش کرے۔

☆ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ / اَعْرَضَ عَنْ دِيْنِ مُحَمَّدٍ ﷺ: یہاں دو الفاظ لائے جاتے ہیں: ''اور ہر اُس شخص کو ذلیل و رسوا کر دے جو دین محمد ﷺ کو رسوا کر رہا ہو، یا جو دینِ محمد ﷺ سے اعراض کرے''۔

☆ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنْهُمْ: ''اور ہمیں ان لوگوں کے ساتھ کبھی شریک نہ کیجیو''۔ ہم کبھی غلطی سے بھی ان لوگوں کے ساتھی نہ بن جائیں جو حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین کی رسوائی کا موجب بن رہے ہوں۔ درحقیقت اسلام کی رسوائی یہود کے دل کی آرزو ہے۔ لہٰذا ان کے کہنے پر جو کچھ کیا جائے گا، وہ اس دینِ محمد ﷺ کی رسوائی کا سامان ہوگا۔ چنانچہ آج ہماری حکومت یہود و نصاریٰ کے دباؤ میں آ کر اسلام کے جہادی تصور اور دینی اقدار کا جو حلیہ بگاڑ رہی ہے تو یہ دراصل دین محمد ﷺ کو رسوا کرنے کا موجب بن رہی ہے اور اللہ کے غضب کو دعوت دے رہی ہے۔

☆ عِبَادَ اللّٰهِ، رَحِمَكُمُ اللّٰهُ، اِتَّقُوا اللّٰهَ: ''اے اللہ کے بندو! اللہ تم پر رحم فرمائے، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''۔ اللہ سے ڈرو، اصل قوت وہی ہے۔ اصل سپریم پاور وہی ہے۔

## تین اوامر تین نواہی

اس کے بعد سورۃ النحل کی آیت ۹۰ کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اسے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خطبہ جمعہ میں شامل کیا اور ان کے دَور سے اب تک یہ اس کا حصہ چلی آ رہی ہے۔ اس آیت کا شمار قرآن مجید کی جامع ترین آیات میں ہوتا ہے:

☆ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

اس آیت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر خیر اور شر، یعنی وہ تمام باتیں کہ جن کو کرنے کا حکم ہے اور ہر وہ چیز جس سے منع کیا گیا ہے، ان سب کو جامعیت کے ساتھ اس ایک آیت میں سمو دیا ہے۔ گویا یہ قرآن حکیم کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ سورۃ النحل ہی میں قرآن کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ کہ اس میں ہر چیز کی وضاحت موجود ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ یہ آیت اس دعوے کی ایک بہت بڑی گواہی اور ایک واضح ثبوت ہے۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے پہلے تین اوامر کا ذکر فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِى الْقُرْبٰى﴾ ''اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا' احسان کا اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا''۔ اسی طرح تین چیزوں سے منع کر دیا: ﴿وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ﴾ ''اور اللہ منع کرتا ہے بے حیائی کے کاموں سے' تمام منکرات سے اور سرکشی وطغیانی سے۔'' جس چیز کو فطرتِ انسانی ناگوار محسوس کرتی ہے یا وہ کام جس کے کرنے سے آپ کا ضمیر ملامت کرتا ہے' وہ سب چیزیں منکرات میں شامل ہیں۔ اور اپنی حدود کو پھلانگنا اور دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا سرکشی ہے۔

اب اس آیت کی تشریح کی طرف آتے ہیں۔ تفسیر عثمانی میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ''عدل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد' اعمال' اخلاق' معاملات' جذبات' اعتدال وانصاف کے ترازو میں تلے ہوں' افراط وتفریط سے کوئی پلہ جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔ سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہوں۔ جو بات اپنے لیے پسند نہ کرتا ہو اپنے بھائی کے لیے بھی پسند نہ کرے''۔ یہ ہے پہلا لفظ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے عدل کا! اور عدل ان تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔

عقائد میں عدل کیا ہے؟ اس کائنات میں سب سے بڑی حقیقت ''توحید'' ہے جو عقلی طور پر بھی ثابت ہے۔ جتنا زیادہ انسان مشاہدہ کرے گا اس کون ومکاں میں' زمین وآسمان میں اور مظاہر فطرت میں تو ایک بات لازماً پختہ ہوگی۔ وہ یہ ہے کہ کوئی ایک حکمت' کوئی ایک ارادہ' کوئی ایک اختیار ہے جو اس تمام نظام کے پیچھے کارفرما ہے۔ سورۃ الانبیاء میں بڑے سادے انداز میں اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان فرمایا: ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ (آیت ۲۲) ''آسمانوں اور زمین میں اگر ایک سے زیادہ الٰہ (معبود) ہوتے' (ایک سے زائد بااختیار ہستیاں ہوتیں) تو یہاں فساد برپا ہو جاتا''۔ اگر مختلف خالق ہوتے تو ہر ایک اپنی مخلوق کو لے کر کائنات کے تخت حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے زور آزمائی کرتا' کھینچ تان ہوتی' اقتدار کی رسہ کشی ہوتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی جتنی آگے بڑھے گی' اتنی ہی یہ بات پختہ ہوگی کہ اس سارے نظامِ کائنات میں ایک ہی حکمت' ایک ہی ارادہ' ایک ہی مشیت اور ایک ہی اختیار کارفرما ہے۔ اس حقیقت کا اقرار عقیدے اور نظریے کا عدل ہے اور اس سب سے بڑی حقیقت کا انکار سب سے بڑی ناانصافی ہے' جسے شرک کہا جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں صاف اعلان کر دیا گیا: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿١٣﴾﴾ (لقمان) ''شرک سب سے بڑا ظلم ہے''۔ یہ سب سے بڑی ناانصافی ہے' کیونکہ اتنی جلی حقیقت کا انکار کرنا دراصل اللہ کے معاملے میں ظلم و زیادتی کے مترادف ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ مشرک کی کوئی بخشش نہیں۔ ہاں موت سے پہلے اگر اس نے توبہ کر لی اور توحید پر آ گیا' تو اللہ تعالیٰ بخش دے گا' لیکن اگر اسی شرک کے ساتھ مر گیا تو وہاں اس کے لیے کوئی معافی نہیں۔ یہ ضابطہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں دو مرتبہ بیان فرمایا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (آیت ۴۸ و ۱۱۶) ''اللہ تعالیٰ اس کو ہرگز نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا''۔ یہ ظلم کی وہ شکل ہے کہ اس کے لیے کوئی معافی نہیں' اور ہونی بھی نہیں چاہیے' کیونکہ انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا' مسجودِ ملائک بنایا' اسے عقل عطا کی اور اسے سماعت و بصارت دی' اسے شعور دیا اور وہ اتنی بڑی حقیقت کا انکار کر رہا ہے' ڈھٹائی کے ساتھ جھٹلا رہا ہے۔ ایسے شخص کے لیے کوئی معافی نہیں ہے۔ ہاں اس سے کم تر گناہوں میں سے جس کو چاہے گا' بخش دے گا' یہ اس کی اپنی صوابدید اور ضابطہ ہے۔ البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اس سے کم تر گناہوں پر جری ہو جائے کہ وہ تو بخش ہی دیے جائیں گے۔ بہرحال عقائد میں عدل توحید کا اقرار ہے کہ اللہ ایک ہے' تنہا ہے' کوئی اس کا ساجھی اور شریک نہیں' کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ اس عقیدے میں عدم اعتدال کا نام شرک ہے۔

اس سے آگے چلیے' اعمال میں عدل کیا ہوگا؟ جب اللہ کو مان لیا اور اللہ سے عہد کیا: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ ''اے پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور ہمیشہ کریں گے'' تو اب عدل کا تقاضا ہے کہ اس عہد کو پورا کیا جائے۔ حقوق اللہ بھی ادا ہوں اور حقوق العباد بھی۔ جن چیزوں کو اللہ نے فرض اور

واجب قرار دیا‘ اگر اس میں ہم نے ڈنڈی ماری تو عدل سے پھر گئے۔ جو فرائض اور واجب اللہ کی طرف سے معین ہو چکے ہیں‘ اس میں کمی کا ہمارے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ کوئی شخص کہے کہ میں نماز تو نہیں پڑھتا اور بہت سے نیک کام کرتا ہوں تو وہ عدل کی پٹڑی سے اترا ہوا ہے۔ اعمال میں عدل یہ ہوگا کہ تمام فرائض اور واجبات کو ادا کرنا‘ اور جو حرام کام ہیں‘ یعنی جن اُمور سے روک دیا گیا ہے‘ ان سے باز آ جانا۔ یہ عدل کا تقاضا ہے۔

معاملات میں عدل کیا ہوگا؟ آپس کے معاملات میں توازن کی روش اختیار کرنا۔ مثلاً کسی سے جو وعدہ کیا ہے اُسے پورا کیا جائے‘ کسی سے کوئی امانت کا معاملہ ہے تو اس میں خیانت نہ کی جائے۔ عدل کے مضمون کو قرآن مجید میں آخری منطقی انتہا تک پہنچایا گیا ہے‘ چنانچہ سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ﴾ ’’اے اہل ایمان! عدل وانصاف کو قائم کرنے والے اور اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ‘‘۔ کس حد تک عدل وانصاف پر قائم رہنا ہے‘ فرمایا: ﴿وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ﴾ (آیت ۱۳۵) ’’اگر (عدل وانصاف کی بات) خواہ تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین کے خلاف یا تمہارے رشتہ داروں کے خلاف بھی جاتی ہو تب بھی عدل پر قائم رہو‘‘۔ اس لیے کہ انسان بالعموم یہاں پر ڈنڈی مار جاتا ہے۔ وہ اپنے تولنے کے باٹ کچھ اور رکھتا ہے اور دوسروں کو کسی اور باٹ سے تولتا ہے۔ معاملات میں عدل یہ ہے کہ سب کو ایک ہی باٹ سے تولو۔ اگر محبت ہے تو اس کی وجہ سے ڈنڈی نہ مار جانا۔ اگر کوئی بات رشتہ داروں کے خلاف جاتی ہو‘ خود اپنے خلاف جاتی ہو‘ یا والدین کے خلاف جاتی ہو‘ بہرصورت حق کا ساتھ دیا جائے۔ یہ نہیں ہے کہ چونکہ فلاں ہمارا رشتہ دار ہے‘ ہماری پارٹی کا ہے لہٰذا خواہ وہ حق پر نہ بھی ہو تب بھی اسی کے پلڑے میں وزن ڈالنا ہے۔ یہ عدل نہیں ہے۔ عدل وہ ہے جو حضور ﷺ نے قائم کر کے دکھایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم بھی آپؐ کی عدالت میں فیصلے کرانے آتے تھے۔ قرآن حکیم نے اس معاملے کے دوسرے رُخ کو بھی واضح کر دیا کہ کسی کی دشمنی کی وجہ سے بھی تم عدل وانصاف سے نہ ہٹ جانا۔ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط﴾ (المائدۃ:۸) ’’مسلمانو! کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے عدل وانصاف کے گواہ بن کر‘ اور دیکھنا کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم راہِ عدل سے ہٹ جاؤ‘‘۔ یہ ہے معاملات کا عدل۔

اخلاقیات میں عدل کیا ہوگا؟ ایک دوسرے کا احترام‘ ایک دوسرے کی عزت۔ کسی کی عزتِ نفس پر حملہ نہ کیا جائے‘ ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی آپ کی عزتِ نفس پر حملہ کرتا ہے‘ آپ کے ساتھ زیادتی کرتا ہے تو عدل کا تقاضا یہ ہے کہ آپ بھی اتنا ہی بدلہ لیں‘ اس سے تجاوز نہ کریں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا﴾ (الشوریٰ:۴۰) قرآن نے یہ اصول دے دیا کہ ’’برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے‘‘۔ یعنی تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرے تو تم بھی اسی کے مثل‘ جتنی اس نے زیادتی کی ہے‘ اس کے ساتھ زیادتی کر سکتے ہو‘ اس سے زیادہ کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ اس حوالے سے سورۃ المائدۃ کی یہ آیت بڑی مشہور ہے: ﴿وَکَتَبْنَا عَلَیْھِمْ فِیْھَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ط﴾ (آیت ۴۵) یعنی کسی نے آنکھ پھوڑی ہے تو جواباً اس کی آنکھ پھوڑی جا سکتی ہے‘ دانت توڑا ہے تو دانت توڑا جا سکتا ہے‘ جس طرح کا زخم لگایا اس کے بدلے میں زخم لگانے والے کو اسی طرح کا زخم لگایا جائے گا۔ یہ ہے عدل! اگرچہ احسان اس میں کیا ہے؟ وہ ہے معاف کر دینا۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

اب آگے آیئے! جذبات میں بھی عدل مطلوب ہے۔ انسانی جذبات کی بہت سی صورتیں ہیں۔ غصہ بھی ایک جذبہ ہے‘ اس میں بھی عدل چاہیے۔ انسان غصے سے بالکل پاک ہو جائے یہ بھی کوئی مطلوب شے نہیں ہے۔ اس طرح غیرت وحمیت بھی ختم ہو جائے گی۔ اگر ایک مؤمن دیکھ رہا ہے کہ شریعت کے اصول اور احکام پامال ہو رہے ہیں‘ دینی قدروں کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں تو اس پر اس کا خون کھولنا چاہیے‘ چہرے کا رنگ تو

متغیر ہونا چاہیے۔ لیکن اس صورت حال میں عدل کیا ہوگا؟ عدل اس میں یہ ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لیے آنحضور ﷺ نے جو طریقہ کار اختیار فرمایا' اس پر عمل پیرا ہوا جائے۔ یہ نہیں کہ ایک دفعہ نکلے' چند نعرے لگائے اور اپنے جذبات کا اظہار کر کے فارغ ہو گئے' گویا ہم نے حق ادا کر دیا۔ بہرحال غصے کے اندر بھی اعتدال کی ضرورت ہے' اور اس کے لیے ہمیں سیرتِ رسول ؐ اور سیرت صحابہؓ سے رہنمائی لینی ہوگی۔ یعنی غصہ میں انسان بے قابو نہ ہو جائے' بلکہ اس کا اظہار صحیح جگہ پر اور صحیح طریقے پر ہو۔

اسی طرح نیکی بھی ایک جذبہ ہے' اس میں بھی اعتدال مطلوب ہے۔ حضور ﷺ نے اس کی بھی مثالیں قائم فرمائیں اور اُمت کو تعلیم دی۔ ایک صحابیؓ نے کہا کہ میں انفاق فی سبیل اللہ کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں نیکی کا جذبہ اتنا بیدار ہوا کہ کہنے لگے میں اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں دینا چاہتا ہوں۔ آنحضور ﷺ نے ان کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا' بلکہ فرمایا کہ اپنی اولاد اور ورثاء کے لیے بھی تو کچھ رکھو۔ یہ نہ ہو کہ کل تمہاری اولاد دست سوال دراز کرتی پھرے۔ انہوں نے کہا کہ میں آدھا دے دیتا ہوں۔ آپ ؐ نے فرمایا: یہ بھی قبول نہیں۔ پھر انہوں نے کہا: ایک تہائی دے دیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں یہ قبول ہے اور یہ بھی بہت ہے۔ یہ ہے نیکی میں اعتدال۔ اس ضمن میں تین صحابہؓ کا واقعہ نہایت اہم ہے۔ ان پر نیکی کا بڑا غلبہ ہوا۔ اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن میں سے بعض کی خدمت میں وہ حاضر ہوئے اور آنحضور ﷺ کی نفلی عبادات کے بارے میں سوال کیا کہ آپ ؐ رات کو کتنا قیام کرتے ہیں؟ نفلی روزے کتنے رکھتے ہیں؟ وغیرہ۔ انہیں بتایا گیا کہ آنحضور ﷺ کچھ وقت رات کا آرام بھی کرتے ہیں اور رات کا ایک بڑا حصہ کھڑے بھی رہتے ہیں۔ آپ ؐ نفلی روزے بھی رکھتے ہیں اور ناغے بھی کرتے ہیں۔ کبھی نفلی روزے رکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اب شاید مسلسل ہی رکھیں گے اور کئی دفعہ ناغہ کرنے پر آتے ہیں تو مسلسل ناغہ ہوتا ہے۔ جو صورت حال تھی وہ ازواج مطہراتؓ نے سامنے رکھ دی۔ حدیث میں الفاظ آتے ہیں کہ اُن تینوں نے اپنے خیال میں اسے کم تصور کیا۔ وہ اس سے زیادہ کی توقع لیے ہوئے تھے۔ لیکن ساتھ ہی اپنے آپ کو قائل کیا کہ چونکہ آنحضور ﷺ معصوم عن الخطا ہیں اور اگر کسی درجے میں خطا کا کوئی امکان ہو بھی تو قرآن میں یہ بات آ گئی کہ آپ ﷺ کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف ہیں' لہٰذا آپ ؐ کے لیے تو اتنا کافی ہے' لیکن ہمیں اس سے کچھ بڑھ کر کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ایک نے طے کر لیا کہ میں تو ساری عمر شادی نہیں کروں گا' بس اللہ سے لو لگاؤں گا۔ دوسرے نے طے کیا کہ میں ساری رات کھڑا رہوں گا' اپنی کمر بستر سے نہیں لگاؤں گا۔ تیسرے نے طے کر لیا کہ میں ہمیشہ روزے رکھوں گا' کوئی ناغہ نہیں کروں گا۔ اب بظاہر یہ نیکی کا جذبہ اور خیر کا کام ہے اور بڑے اُونچے عزائم ہیں' لیکن اعتدال دیکھئے جو حضور ﷺ نے اُمت کو تلقین فرمایا۔ آپ ﷺ کے علم میں جب یہ بات آئی تو آپ ؐ نے ان تینوں کو بلایا' اس لیے کہ اس معاملے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا' کیونکہ اس سے غلط روایت پڑ سکتی تھی۔ آپ ؐ کے چہرے سے بھی اس روش پر ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا اور آپ ؐ کے الفاظ سے بھی ناراضگی واضح ہوتی ہے۔ فرمایا: ((وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَتْقَاکُمْ لَہٗ)) ''اللہ کی قسم! میں تم میں سے سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں''۔ یہ غیر معمولی الفاظ ہیں' لیکن اس معاملے کی اہمیت کو سمجھانے کے لیے آنحضور ﷺ نے یہ انداز اختیار فرمایا۔ اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ' فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))[1] ''لیکن میں (نفلی) روزے رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں' (رات کو) نماز (تہجد) بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' اور میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ پس جسے میرا طریقہ پسند نہیں ہے (جو مجھ سے بھی آگے جانے کی کوشش کر رہا ہے) اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ اسلام یہ تعلیم نہیں دیتا کہ انسان اپنے نفس کو کچل ڈالے اور اس دنیا سے بالکل کٹ جائے۔ ہمارے دین کی رہبانیت ایک ہی ہے' اور وہ جہاد و قتال کے لیے گھر بار چھوڑ کر نکلنا ہے۔ اس میں ظاہر بات ہے کہ وقتی طور پر انسان گھر بار چھوڑتا ہے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر جاتا ہے۔ دنیا کو ترک کرنے کی صرف یہ شکل ہے کہ جو اللہ کو پسند ہے کہ آدمی جہاد و قتال کے لیے' غلبہ دین کے لیے

گھر بار سے نکلے۔ لیکن نیکی میں بھی عدل واعتدال ضروری ہے اور اس معاملے میں ہمارے لیے اُسوۂ کامل نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہے۔

یہاں تک بات ہوئی عدل کی کہ کس طرح عقائد‘ اعمال‘ اخلاقیات اور جذبات میں عدل کی ضرورت ہے‘ اور صرف ایک لفظ ’’عدل‘‘ میں کتنی وسعت ہے۔ اس آیت میں دوسرا حکم اللہ نے احسان کا دیا۔ احسان کیا ہے؟ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنی تفسیر میں بہت جامعیت کے ساتھ اس کی بھی وضاحت فرمادی کہ ’’انسان بذاتِ خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے‘ مقامِ عدل وانصاف سے ذرا اور بلند ہو کر‘ فضل وعفو اور تلطف و ترحم کی خو اختیار کرے۔ فرض ادا کرنے کے بعد تطوع وتبرع کی طرف قدم بڑھائے‘‘۔ میں اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ فضل کیا ہے؟ ایک شخص سے آپ نے طے کیا کہ وہ آٹھ گھنٹے کام کرے گا اور اس کی مزدوری سو روپے ہو گی۔ عدل یہ ہے کہ اس نے آٹھ گھنٹے کام کیا تو آپ نے سو روپے اس کو دے دیے۔ احسان کیا ہے؟ یہ دیکھتے ہوئے کہ کام اچھا کیا ہے‘ محنت سے کیا ہے‘ آپ اس کی اجرت دیتے ہوئے مزید اپنی طرف سے دس بیس روپوں کا اضافہ کر دیں‘ یہ احسان ہے۔ میں نے عدل کے معاملے میں وضاحت کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے کہ تمام فرائض اور واجبات کو ادا کرنا عدل کا تقاضا ہے۔ اس پر نفل کا جو اضافہ ہو گا وہ احسان ہے۔ فرض نماز کے علاوہ سنتیں اور نوافل بھی ادا کرے۔ فرض روزے کے علاوہ بھی روزے رکھے۔ انفاق کے ضمن میں عدل یہ ہو گا کہ ٹھیک ٹھیک زکوٰۃ ادا کی جائے۔ اس سے زیادہ اگر وہ اللہ کے دین اور اس کی مخلوق پر خرچ کر رہا ہے تو یہ احسان ہے۔

اس سے آگے تفسیر عثمانی میں یہ الفاظ ہیں کہ احسان یہ ہے کہ ’’انصاف کے ساتھ مروّت کو جمع کرے اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی وہ کرے گا اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ ادھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی کی صورت میں ملے گا‘‘۔ یہ ساری بات اللہ سے عہدِ بندگی کے حوالے سے ہو رہی ہے۔ ہم نے اللہ کو اپنا رب مانا ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ﴾ اور اقرار کیا کہ اسی کو اپنا مشکل کشا اور حاجت روا سمجھیں گے۔ ﴿وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ اور یہ مانا کہ قرآن اس کا کلام ہے‘ اس کی دی ہوئی ہدایت ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اصل منزل آخرت ہے‘ یہ دنیا دار الامتحان ہے‘ اب میں جتنا زیادہ کروں گا‘ اتنا بدلہ پاؤں گا۔ ایک تو فرض اور واجب ہے جس کے بارے میں باز پرس ہو گی‘ اس سے زیادہ جو کچھ کر رہا ہوں یقیناً اس کے بدلے وہاں زیادہ ملے گا۔ یہ احسان کی روش ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿٦٠﴾﴾ (الرحمٰن)

عقائد اور ایمان کے اعتبار سے بھی احسان کی تعریف حدیث میں آئی ہے۔ عدل تو یہ ہے کہ انسان شرک سے بچ جائے‘ توحید پر کاربند رہے۔ لیکن یہ توحید یعنی اللہ پر ایمان‘ یقین اور توکل جب اس درجے کا ہو جائے کہ ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ‘ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))[(1)] یعنی ’’تم اللہ کی بندگی ایسے کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو‘ (ہر وقت اللہ کی موجودگی کا احساس رہے) پھر اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو (کم از کم یہ احساس ہر وقت رہے کہ) وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے‘‘۔ تو یہ درجۂ احسان ہے۔ اس جذبے کے ساتھ انسان جو بھی بندگی کرے گا‘ اس میں خوبصورتی اور نکھار پیدا ہو گا۔ نماز فرض ہے‘ اگر آپ نماز پڑھتے ہیں اس احساس کے ساتھ کہ میں اس وقت اللہ کی نگاہ میں ہوں اور میں اللہ سے ہم کلام ہوں تو اس نماز میں جو حسن پیدا ہو گا وہ درجہ احسان کا ہے۔

معاملات میں بھی احسان کا معاملہ ہوتا ہے۔ کسی شخص سے آپ نے قرض لیا اور اس میں اگر طے کر لیا کہ واپسی اضافے کے ساتھ ہو گی تو یہ سود ہے اور انتہائی سنگین اور بھیانک جرم ہے۔ جبکہ عدل یہ ہے کہ جتنا قرض آپ نے کسی کو دیا تھا‘ اتنا ہی واپس لیں‘ جتنا کسی سے لیا ہے اتنا ہی واپس کریں۔ لیکن اس میں احسان کیا ہے؟ حضور ﷺ کا معمول تھا کہ کسی سے کچھ قرض لیتے واپس لوٹاتے ہوئے اپنی مرضی سے اس میں کچھ بڑھا دیتے تھے۔ طے نہیں تھا کہ بڑھانا ہے۔ یہ تطوع ہے۔ یعنی تم ایک مشکل وقت میں میرے کام آئے تھے‘ میں اپنی مرضی سے تم کو اضافی رقم دے رہا ہوں۔ یہ معاملات کے اندر احسان کی شکلیں ہیں۔

اس آیت میں تیسری بات یہ فرمائی: ﴿وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی﴾ ''(اللہ حکم دیتا ہے) رشتہ داروں کو (اُن کے حقوق) ادا کرنے کا''۔قریبی رشتہ دار دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ مستحق ہیں۔ یہ کام زیادہ مشکل ہوتا ہے' اس لیے کہ عام طور پر قریبی عزیزوں کے ساتھ شکوے شکایتیں بھی ہوتی ہیں۔ چوتھے محلے جا کر خیرات بانٹنا آسان ہے۔ یہ صلہ رحمی کا حکم ہے کہ رشتہ داروں' والدین' بہن بھائیوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ محلے داروں' پڑوسیوں اور دوسرے مسلمانوں کے حقوق کی ادائیگی دراصل عدل واحسان کے تحت آتی ہے' لیکن رشتہ داروں کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے' عدل واحسان میں ان کو مقدم رکھا جانا چاہیے' اس لیے اس کو علیحدہ سے نمایاں کر دیا۔

یہ تین باتیں ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا۔ اس کے بعد تین سے منع فرمایا۔ ارشاد ہوا: ﴿وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ﴾ فَحْشَاء سے مراد ہر قسم کی فحش بات اور بے حیائی ہے۔ شیطان اس راستے سے انسان کو صراطِ مستقیم سے بچلاتا اور راہِ حق سے منحرف کرتا ہے۔ ''منکر'' ہر وہ شے ہے جو معروف کے خلاف ہو۔ فطرتِ انسانی جس سے کراہت محسوس کرے' جسے ناگوار محسوس کرے' ایسی سب چیزیں منکرات میں شامل ہیں۔ کسی کا دل دکھانا' کسی کو دھوکا دینا' بدعہدی کرنا' امانت میں خیانت کرنا' جھوٹ بولنا' غلط بیانی کرنا' کسی کا مذاق اڑانا' ملاوٹ کرنا' سود اور جوا یہ سب منکرات ہیں' ان سے روک دیا گیا۔

''وَالْبَغْیِ'' سے ہر قسم کی طغیانی اور سرکشی مراد ہے۔ کسی دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا' والدین کے سامنے سر اٹھانا' اساتذہ کی بے ادبی کرنا' یہ سب طغیانی اور سرکشی کی شکلیں ہیں۔ طغیانی کی سب سے بڑی شکل وہ اجتماعی نظام ہے جو اللہ کی بغاوت پر مبنی ہے' جو آج پوری دنیا میں رائج ہے۔ اِس وقت دنیا میں اللہ کے خلاف بغاوت' سرکشی اور طغیانی کا معاملہ اپنے عروج پر ہے۔ سیاسی سطح پر سیکولرازم دراصل ''اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی'' کا نعرہ ہے کہ ہم نہیں مانتے کہ کوئی اللہ ہے' کوئی خالق و مالک ہے' اگر ہے بھی تو وہ وہیں آسمانوں میں رہے۔ زمین میں اپنا نظام' اپنا دستور اور اپنے قوانین ہم خود بنائیں گے' یہاں ہمیں اللہ کی مداخلت ہرگز گوارا نہیں ہے۔ یہ ہے سیکولر نظام۔ اسی طرح معیشت میں سود کا نظام ہے' جس کے بارے میں قرآن میں ہے کہ اگر سود نہیں چھوڑتے تو اللہ اور رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ آج پوری دنیا نے سود اختیار کیا ہوا ہے۔ اللہ اور رسولؐ کے خلاف محاذِ جنگ دانستہ طور پر کھولا گیا ہے۔ یہ ہے طغیانی اور سرکشی۔ معاشرتی سطح پر آ جائیں۔ بے حیا مادر پدر آزاد معاشرت' تہذیب اور کلچر عام ہے۔ یہ شیطانی تہذیب ہے' کیونکہ فحاشی شیطان کا ہتھکنڈہ ہے' جسے قرآن نے بایں الفاظ واضح کیا: ﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ (البقرۃ:۲۶۸) ''یہ شیطان ہے جو تمہیں فقر سے ڈراتا ہے (اور اس طرح انفاق سے روکتا ہے) اور حکم دیتا ہے تمہیں فحشاء کا''۔ یہ شیطانی کلچر ہے جو آج ہمارے گھروں تک پہنچا ہوا ہے' وہ کیبل کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں ہو۔ ہم انفرادی طور پر بھی فحاشی کو فروغ دے رہے اور ہمارے حکمرانوں نے بھی ہر چیز کے دروازے کھول دیے ہیں۔ شیطانی تہذیب ہو یا شیطانی نظام' آج تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اس نظام اور کلچر کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔ بہرحال جن چیزوں سے اللہ نے روکا ہے انہیں ہم سینہ زوری کے ساتھ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ان سے بچنا ضروری ہے۔

آگے فرمایا: ﴿یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾﴾ ''اللہ تمہیں نصیحت کر رہا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو (ہوش میں آؤ)''۔ یہ ساری باتیں اس لیے بیان نہیں کی گئی ہیں کہ انہیں ایک کان سے سنو اور دوسرے سے نکال دو' یا ان کو محض اجر وثواب کے لیے پڑھ لو' بلکہ ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ جن کاموں سے روکا گیا ان سے رک جاؤ اور جن کو کرنے کا حکم دیا گیا ان کو انجام دو۔ اگر تم مسلمان ہو تو یہ لازمی تقاضا ہے۔

اب اسی آیت کے تناظر میں ہم آج کے اپنے ماحول کو دیکھیں۔ ہم جشن بہاراں منانے چلے ہیں جبکہ دنیا میں کیا حالات ہیں! انسانیت سسک رہی ہے۔ ''سونامی'' کی صورت میں عذاب الٰہی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں' لیکن ہمارے لچھن وہی ہیں۔ کیا ہم بھی اللہ کے کسی عذاب کا انتظار

کر رہے ہیں؟ سونامی طوفان کے ہاتھوں لاکھوں انسان لقمۂ اجل بنے‘ جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ یہ ایک نقشہ ہے۔ دوسرا نقشہ یہ ہے کہ امریکہ افغانستان اور عراق میں مسلمانوں کا قتل عام کر رہا ہے اور اب ایران پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یہ دین سے دُوری اور اللہ کے دین کو قائم نہ کرنے کی سزا ہے کہ آج مسلمان ملکوں کی حالت ایسے ہے جیسے بھیڑوں میں سے کسی ایک بھیڑ کو پکڑ کر قصاب ذبح کرتا ہے‘ پھر دوسری کو‘ پھر تیسری کو‘ اور بھیڑیں اس قابل نہیں ہوتیں کہ اس قصاب کے خلاف مل کر کوئی مشترکہ لائحہ عمل مرتب کر سکیں اور اس کی سفاکیت کے خلاف کھڑی ہو سکیں۔ بس وہ انتظار کر رہی ہوتی ہیں کہ اب کس کی باری ہے۔ یہی نقشہ ہمارا ہے۔ اب امریکہ کا رُخ ایران کی طرف ہے۔ پہلے خیال تھا کہ شام کی باری آئے گی‘ لیکن اس نے اپنا رُخ ایران کی طرف کر لیا ہے۔ اور یہ بات سب کو معلوم ہے جس وجہ سے وہ ایران آیا ہے‘ اس وجہ سے پاکستان میں آنا اس کا لازمی حصہ ہے۔ اس نیوکلیئر ٹیکنالوجی میں ہم ایران سے چار قدم آگے کھڑے ہیں۔ نیوکلیئر ٹیکنالوجی کسی مسلمان ملک کو مل جائے‘ یہود و نصاریٰ کو یہ قطعاً گوارا نہیں۔

دہشت گردی کے خلاف جو عالمی مہم ہے وہ دراصل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہے۔ امریکی حکومت کے جو بیانات آج کل آ رہے ہیں ان میں اس بات پر شدید اندیشہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کہیں دہشت گردوں اور بنیاد پرستوں کے ہاتھ نہ چڑھ جائیں۔ امریکہ دراصل اسی بہانے کی آڑ میں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ وہ کبھی ہمارا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنے ربّ کو راضی کر کے اس کی مدد حاصل کی جائے۔ لیکن ہمارے لچھن کیا ہیں؟ جشن بہاراں منایا جا رہا ہے‘ بسنت منائی جا رہی ہے‘ میراتھن ریس ہو رہی ہے‘ جبکہ اس وقت اس بڑے دشمن کے مقابلے میں قوم کو جگانے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ایک طرف ہم پانچ فروری کو کشمیریوں کے ساتھ یوم یکجہتی منانے کا عزم رکھتے ہیں تو دوسری طرف چھ فروری کو ہندوؤں کا تہوار بسنت منانے کی قومی سطح پر تیاریاں کر رہے ہیں۔ کیا ہم اللہ کے غضب کو دعوت نہیں دے رہے؟ بسنت تو ایک عنوان ہے‘ اس عنوان کی آڑ میں جو افراتفری اور فحاشی کا ارتکاب ہوتا ہے‘ ان سب کو آپ ذہن میں لایئے۔ کیا ہم اللہ کے غضب کو دعوت نہیں دے رہے؟ لہٰذا حکومت سے التماس ہے کہ وہ بسنت منانے اور جشن بہاراں کا انعقاد چھوڑ کر پتنگ کی ڈور کی فروخت پر مستقل پابندی عائد کرے اور علامہ اقبال اور قائداعظم کے تصورات کے مطابق مملکت خداداد پاکستان میں دین حق کے حقیقی قیام اور شریعت کے نفاذ پر کمربستہ ہو جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی سطح پر توبہ کریں اور اصلاحِ حال پر کمربستہ ہو جائیں۔ اس کا صرف اور صرف یہ طریقہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں سمیت ہر شخص پہلے اپنی ذات پر اور پھر ملک میں حقیقی اسلام نافذ کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو جائے۔

☆اُذْكُرُوا اللّٰهَ يَذْكُرْكُمْ وَادْعُوْهُ يَسْتَجِبْ لَكُمْ: ’’تم اللہ کو یاد رکھو‘ وہ تمہیں یاد رکھے گا‘ اور تم اس سے دعا کرو‘ وہ تمہاری دعا قبول کرے گا‘‘۔ اللہ کو یاد رکھنا یہ بھی ہے کہ زبان سے اللہ کا ذکر ہو اور ایک شکل یہ ہے کہ ہر وقت اس بات کا خیال رہے کہ کہیں اللہ کا کوئی حکم تو نہیں ٹوٹ رہا۔ جب تم ایسا کرو گے تو اللہ بھی تمہیں بے کس و بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔

☆وَلَذِكْرُ اللّٰهِ تَعَالىٰ اَعْلىٰ وَاَوْلىٰ وَاَهَمُّ وَاَكْبَرُ: ’’اور یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کا ذکر سب سے بلند‘ سب سے مقدم‘ سب سے اہم اور سب سے بڑا ہے‘‘۔

☆وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ: ’’اور جو کچھ تم کرتے ہو‘ اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے‘‘۔

یہاں خطبہ جمعہ مکمل ہو گیا۔ اس خطبے کے ذریعے سے جو ہدایت اور موعظت ہمارے سامنے آئی ہے‘ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اس کے مطابق استوار کر سکیں۔ آمین!